الحمد

تحقیقی و تنقیدی مجلہ

- ❖ الحمد ہائر ایجوکیشن کمیشن سے منظور شدہ مجلہ ہے۔
- ❖ الحمد کے سال میں دو شمارے شائع ہوتے ہیں۔
- ❖ الحمد میں شائع ہونے والے مقالات ماہرین کے پاس
  جانچ / حتمی منظوری کے لیے ارسال کیے جاتے ہیں۔

- ❖ اپنے مقالے کے ساتھ اُس کا انگریزی ملخص (Abstract) ضرور شامل کیجیے۔
- ❖ ملخص کے بغیر مقالہ مجلس ادارت میں پیش نہیں کیا جائے گا۔
- ❖ الحمد میں اشاعت کی غرض سے (ایم۔ایس ورڈ) میں کمپوز شدہ مضمون کی
  سوفٹ کاپی sher.ali@alhamd.pk پر ارسال کیجیے۔
- ❖ تمام مقالات نیک نیتی اور علمی خدمت کے جذبے کے تحت شایع کیے
  جاتے ہیں۔ مقالہ نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

الحمد

تحقیقی و تنقیدی مجلہ

22

جولائی تا دسمبر 2024ء

ڈاکٹر شکیل روشن (سرپرست اعلیٰ)

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

مدیر

ڈاکٹر شیر علی

شعبۂ اُردو

الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

مجلس ادارت

ڈاکٹر شکیل روشن	سرپرستِ اعلیٰ / صدر، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر محمد اشرف کمال	مدیر اعلیٰ
ڈاکٹر شیر علی	مدیر

مجلس مشاورت (قومی)

ڈاکٹر سعادت سعید	ممتاز پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر انوار احمد	سابق چیئرمین، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
ڈاکٹر ضیاء الحسن	پروفیسر شعبہ اردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر ناصر عباس نیر	پروفیسر، شعبہ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر سلمان علی	چیئرمین، شعبہ اُردو، پشاور یونیورسٹی پشاور
ڈاکٹر محمد کامران	ڈین اورینٹل لرننگ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر طارق ہاشمی	ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی۔ سی یونیورسٹی، فیصل آباد

مجلس مشاورت (بین الاقوامی)

ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم	چیئرمین شعبہ اردو، الازہر یونیورسٹی، مصر
ڈاکٹر خلیل طوق آر	چیئرمین شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی، ترکی
ڈاکٹر محمد کیومرثی	چیئرمین شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی، ایران
ڈاکٹر آسمان بیلن اوزجان	پروفیسر، شعبہ اردو، انقرہ یونیورسٹی، ترکی
ڈاکٹر مسعود بیگ	پروفیسر شعبہ اردو، علی گڑھ یونیورسٹی، انڈیا
ڈاکٹر احمد محفوظ	پروفیسر شعبہ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، انڈیا
ڈاکٹر محمد آصف زہری	ایسوسی ایٹ پروفیسر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، انڈیا

ناشر: ڈاکٹر شکیل روشن، صدر، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

کمپوزنگ / سرورق: عبدالحفیظ، کریٹیو پبلشرز، فیصل آباد

قیمت: پاکستان:۵۰۰روپے بیرون ملک:۲۰۔امریکی ڈالر

برائے رابطہ: ڈاکٹر شیر علی، الحمد اسلامک یونیورسٹی، شاہ پور، بارہ کہو، اسلام آباد

فون نمبر:0333-9707002, 051-2234000 ای۔میل:sher.ali@alhamd.pk

ترتیب

*	اداریہ	پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف کمال (مدیر اعلیٰ)	۹
1	اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے "کی بعض تحقیقی و فنی فروگزاشتیں	ڈاکٹر مظفر حسین / ڈاکٹر جابر حسین	۱۱
2	کلامِ فیض کا سماجی تناظر	ڈاکٹر نعیم مظہر / ڈاکٹر عثمان غنی رعدؔ	۱۹
3	خلیل طوق آر کا اسلوب شاعری	میمونہ ریاض / ڈاکٹر صدف نقوی	۲۸
4	نکلے تری تلاش میں: تجزیاتی مطالعہ	ناصرہ پروین / ڈاکٹر سعید احمد	۴۰
5	گلستان سعدی: منظوم پنجابی تعارفی مطالعہ	غلام رسول / ڈاکٹر سمیع اللہ	۵۰
6	جمیلہ ہاشمی کے ناولوں میں سیاسی محرکات: مختصر جائزہ	ڈاکٹر محمد ثقلین / افرا تسنیم	۶۹
7	پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ترجمہ شدہ کتاب "جنم دن" کا تجزیاتی مطالعہ	غزالہ نورین / ڈاکٹر صدف نقوی	۷۵

اداریہ

ادب، تبدیلی اور تیز رفتاری

وقت کا قافلہ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ رکنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں اور تیز رو آگے بڑھ جاتے ہیں یہی دنیا کا دستور ہے۔ تیزی کے ساتھ خود کو بدلنا۔ لپکتا، برق رفتاری سے چلتا ہوا گردشِ دوراں کا پہیہ لمحہ بہ لمحہ نت نئی ایجادات سامنے لے کر آرہا ہے۔ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی پہلے کی نسبت کافی تغیر آچکا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے گزرتا ہوا ہر پل ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے۔ خاص طور پر جب سے اکیسویں صدی کا آغاز ہوا ہے اس تبدیلی میں پہلے کی نسبت کئی گنا زیادہ تیزی آچکی ہے۔

امریکی فیوچرسٹ(Futurist) ایلون ٹوفلر (Alvin Toffler) نے ۱۹۷۰ء میں اپنی کتاب فیوچر شاک(Future Shock)میں آناًفاناً تبدیلی پہ جو فکر انگیز تحریر لکھی تھی وہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے خیال میں وقت کے بغیر تبدیلی کی کوئی اہمیت نہیں اور تبدیلی کے بغیر وقت جیسے ٹھہر جاتا ہے۔ اس طرح ادب میں اگر وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی نہ ہو تو ادب اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔

سرسید تحریک کے بعد اُردو ادب میں تبدیلی کے کئی موڑ آئے جن میں سب سے اہم موڑ ترقی پسند ادب کا تھا جس نے اردو ادب کو سماجی تبدیلی کے گھڑیال کی وقت بدلتی تیز رفتار سوئیوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی۔ بیسویں صدی میں اردو ادب میں کئی رجحانات سامنے آئے، ہر رجحان کسی نہ کسی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اہم بات یہ ہے کہ اُردو ادب نے ہر تبدیلی کا ساتھ دیا۔ ہر چیلنج کو قبول کیا۔ اس کے بعد لسانی تشکیلات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پسِ ساختیات، ردِ تشکیل، نو آبادیات، مابعد نو آبادیات، تاریخیت نو تاریخیت، جیسے مختلف اور اہم موڑ ادبی و تنقیدی تھیوری کی شکل میں بیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں داخل ہوتے چلے گئے۔

قدیم دور سے موجودہ دور تک نہ صرف سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی تبدیلی آچکی ہے بلکہ گزشتہ کچھ دہائیوں سے موسموں میں بھی انتہا درجے کی تبدیلی محسوس کی جارہی ہے۔ جس کی وجہ سے پورا خطہ بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ تبدیلی خوش کن نہیں ہے۔ ماحولیاتی تنقید اس موسمیاتی تبدیلی کا جائزہ لینے کی کوششوں میں مصروف کار ہے۔ بدلتے ہوئے رہن سہن کے ساتھ ساتھ ایک تبدیلی اقتصادی بھی ہے جس نے معاشرے کے مختلف طبقوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے جس کے اثرات براہ راست انسانی زندگی اور ماحول پر مرتب ہو رہے ہیں۔

اسے سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔ انسانی سماج کی بہتری کے لیے ہمیں چاند، سورج، خلا اور سیاروں پہ توجہ دینے کے ساتھ ساتھ زمینی حقائق پہ بھی نظر ثانی کرنا ہوگی۔

اردو ریسرچ جرنل "الحمد" کا بائیس واں شمارہ پیش خدمت ہے۔ گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی نوجوان محققین کے ساتھ ساتھ اردو کے معروف و ممتاز محققین کی نگارشات پر مشتمل ہے۔ ہماری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ الحمد میں شائع ہونے والے مقالات خالصتاً تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے ہوں جن کی عصری، تاریخی اور تحقیقی اہمیت ہو۔ شکر الحمد للہ تحقیقی مجلہ "الحمد" نے بہت کم وقت میں اپنی پہچان قائم کرلی ہے اس میں زیادہ محنت اور خلوص ڈاکٹر شیر علی کا شامل ہے۔ جنھوں نے انتھک محنت سے مجلہ الحمد کو اس کی منفرد شناخت تک پہنچادیا ہے۔ موجودہ شمارہ مشمولات کے حوالے سے اہم اور متنوع مقالات سے مزین ہے۔ جس میں ڈاکٹر مظفر حسین اور ڈاکٹر جابر حسین کا مقالہ "اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے" کی بعض تحقیقی وفنی فروگزاشتیں" تحقیق کے مختلف مدارج کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح غزالہ نورین اور ڈاکٹر صدف نقوی کا مقالہ "پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ترجمہ شدہ کتاب "جنم دن" کا تجزیاتی مطالعہ "ترجمہ کے حوالے سے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ میمونہ ریاض اور ڈاکٹر صدف نقوی کا مقالہ اُردو کے ترک شاعر "خلیل طوق آر کا اُسلوب شاعری" شاعری کی فنیاور فکری کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر نعیم مظہر کا مقالہ "کلام فیض کا سماجی تناظر" فیض احمد فیض کی سماج اور انسان کے لیے نظریاتی وابستگی اور ادبی کاوش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناصرہ پروین اور ڈاکٹر سعید احمد کا مقالہ "نکلے تری تلاش میں: تجزیاتی مطالعہ "مستنصر حسین تارڑ کی سفر نامہ نگاری کا مشاہداتی حوالے سے احاطہ کرتا ہے۔ غلام رسول اور ڈاکٹر سمیع اللہ کا مقالہ "گلستان سعدی: منظوم پنجابی تعارفی مطالعہ "ایک زبان سے دوسری زبان میں منظوم ترجمہ نگاری کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ثقلین اور افرا تسنیم کا مقالہ "جمیلہ ہاشمی کے ناولوں میں سیاسی محرکات: مختصر جائزہ "جمیلہ ہاشمی کے ناول کا سیاسی تناظر میں محاکمہ پیش کرتا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ کو یہ شمارہ پسند آئے گا۔

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

چیف ایڈیٹر

''اردو تحقیق: صورتِ حال اور تقاضے'' کی بعض تحقیقی و فنی فروگزاشتیں

Some Technical and Research Related Errors of "Urdu Tehqiq: Sorat e Hal Aur Taqazey"

ڈاکٹر مظفر حسین* / ڈاکٹر جابر حسین**

Abstract:

"Urdu Tehqiq:sorat e hal aur Taqazay" is an Urdu research book written and compiled by the reknown Pakistani urdu researcher Dr. Moinuddin Aqeel.This book is basically a collection of the articles written by the author on different literary topics.Most of these articles are already published in different urdu research journals in pakistan.

There are some technical, historical and research related faults/errors in this book. Generally four kinds of errors and faults in this book:

1: Authors confussion about quality and quantity of urdu research in Pakistan

2: Errors related to the publishing years of books which are mentioned as reference books in this book.

3: Errors related to the names of books mentioned here in this book.

4: Repetetion of the textual discussions/materials.

This article throughs light on the above mentioned faults and defficienties of the book.

*شعبہ اردو، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد کیمپس

**شعبہ اردو، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد کیمپس

''اردو تحقیق: صورت حال اور تقاضے''جناب قابلِ صد احترام ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر صاحب موجودہ دور میں پاکستان کے مایۂ افتخار گنے چنے اردو محققین میں ایک معتبر اور بڑے محقق ہیں۔ یہ کتاب ان کے بعض ایسے تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے جو انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف مناسبتوں سے تحریر کیے اور جو ملک کے مختلف جرائد اور تحقیقی مجلات میں چھپے۔ کتاب میں کچھ کتابوں پر لکھے گئے تبصرے بھی شامل ہیں۔ بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو اس کتاب میں شامل ہونے سے پہلے الگ کتابچوں کی صورت میں چھپے۔ کتاب کا غالباً ایک چوتھائی حصہ اُن مقالات پر مشتمل ہے جو انھوں نے مختلف سیمیناروں میں پیش کیے۔ یہ کتاب پہلی بار مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے ۲۰۰۸ میں اور دوسری بار کچھ اضافوں کے ساتھ القمر انٹر پرائزز لاہور سے ۲۰۱۴ء میں چھپی اور بعض پاکستانی جامعات میں اردو ایم فل / پی ایچ ڈی کے نصاب میں بھی شامل رہی۔

کتاب بنیادی طور پر اپنے تحقیقی موضوعات اور واجب الاحترام ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی کد و کاوش کے اعتبار سے تو بلا شبہ لائقِ ستائش و قابلِ قدر ہے لیکن بعض تحقیقی سہویات اور کچھ ایسے فنی مسائل کتاب میں راہ پا گئے ہیں جن کے باعث اس وقیع کاوش کی Orignality اور اردو تحقیق کی راہنما کتاب ہونے کی حیثیت کو ٹھیس پہنچی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں کتاب کا پہلا ایڈیشن کو پیشِ نظر رہا ہے۔ امید و توقع تھی کہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ڈاکٹر صاحب متذکرہ مسائل اور سہویات کی جانب توجہ دے کر ان کو رفع کر دیں گے لیکن شاید ان مسائل کی جانب ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی اور کتاب کے دوسرے ایڈیشن(۲۰۱۴) میں بھی پہلے ایڈیشن(۲۰۰۸) میں موجود سہویات و مسائل بعینہ موجود رہیں۔ یہاں انہی مسائل و فروگزشتوں کی جانب واجب الاحترام ڈاکٹر صاحب کی محض توجہ دلانا مقصود ہے۔ مجموعی طور پر مسائل و فروگزشتوں کی نوعیت چار طرح کی ہے۔ ان فروگزشتوں اور سہویات کا تعلق زیر نظر کتاب میں ذکر کردہ کتابوں کے ناموں اور ان کے سنین کے اندراج، مواد کی تکرار اور پہلے بیان کردہ کسی مدعا کی دوسری جگہ تردید جیسے امور سے ہے۔ اس مضمون میں انہی امور کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے نیز درست سنین کے اندراج اور تکراری مواد و صفحات کی کمیت و کیفیت کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ بعض تحقیقی فروگزشتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

الف: کتابوں کے ناموں اور ان کے سنینِ اشاعت و کتابت

فاضل مصنف نے اپنے مضامین میں ایک جگہ ایک کتاب کا پورا نام درج کیا ہے جبکہ کسی دوسری جگہ نام کے بعض الفاظ درج نہیں کیے ہیں یا نام کو ردّوبدل کر کے درج کیا ہے جس سے قاری اس غلط فہمی و اشتباہ کا شکار

ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور محقق گارساں دتاسی کی ایک کتاب کے نام کو ملاحظہ کیجیے جسے فاضل مصنف نے دو مختلف مقامات پر یوں درج کیا ہے۔

۱۔ تاریخ ادب ہندوستانی(۱)

تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی(۲)

کتاب کا اصل نام تاریخِ ادبیات ہندوی و ہندوستانی ہے جو کہ فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اردو میں اس کا ترجمہ جامعہ کراچی کے شعبۂ اُردو نے کروایا تھا۔

۲۔ ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب Twentieth Century Urdu Literature بڑودہ سے ۱۹۷۴ء میں انگریزی زبان میں چھپی۔ ترمیم و اضافہ کے ساتھ کراچی سے ۱۹۸۲ء میں چھپی۔ ترمیم و اضافے کے ساتھ چھپنے والے اس ایڈیشن کے سن کے اندراج میں سہل انگاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً صفحہ نمبر ۱۶۱، سطر نمبر ۱ میں کتاب کا سنِ اشاعت ۱۹۸۳ء لکھا گیا ہے جبکہ صفحہ نمبر ۲۹۳، سطر نمبر ۱۴ میں ۱۹۸۲ء لکھا گیا ہے۔

۳۔ عین الحق فرید کوٹی کی "اردو زبان کی قدیم تاریخ" کی ایک ہی اشاعت کے حوالے سے اندراج سنین ملاحظہ کریں:

صفحہ نمبر ۳۳ میں اس کتاب کا سنِ اشاعت ۱۹۷۳ء لکھا گیا ہے جبکہ صفحہ نمبر ۱۸۹ میں اسی کتاب کا سنِ اشاعت ۱۹۷۲ء مرقوم ہے۔

۴۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان یہ تھا "اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ۔" یہ مقالہ جامعہ کراچی میں ڈاکٹریٹ کی سند کے لیے پیش کیا گیا۔ اس کے سن کا اندراج یوں کیا گیا ہے۔

۱: "۔۔۔ جامعہ کراچی نے ۱۹۷۸ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے۔"(۳)

۲: "۔۔۔ ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے۔"(۴)

۳: "۔۔۔ ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے۔"(۵)

ب: متزلزل رائے

فاضل مصنف پاکستان میں اردو تحقیق کی کیفیت و رفتار پر جب قلم فرسائی کرنے لگتے ہیں تو ایک صفحے پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں تو دوسرے ہی صفحے پر اپنے سابقہ اظہار اطمینان کو عدم آشنا کر دیتے ہیں۔ بطور مثال ملاحظہ کیجیے:

"پاکستان میں اردو تحقیق کا معیار اور اسکی رفتار بھارت سے کسی طرح کم نہیں۔۔۔"(۶)

دوسرے ہی صفحے پر متذکرہ بالا رائے یا تحقیقی کاوشوں کو استثنائی مثالیں قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

"۔۔۔جو کچھ بھی مستحسن تحقیقی کام یہاں ہوئے ہیں وہ دراصل استثنائی مثالیں ہیں اور ان سب کے بارے میں بھی یہ کہنا کہ وہ جدید اصولوں کے مطابق کیے گئے ہیں، صحیح نہ ہو گا۔"(۷)

پاکستان میں اردو تخلیق و تحقیق کی مجموعی صورت حال کو ایک جگہ ناقابلِ اطمینان قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پاکستان میں ادبی تخلیق و تحقیق کی موجودہ صورت حال بحیثیت مجموعی قابل اطمینان نہیں کہی جاسکتی۔"(۸)

اسی کتاب میں ایک جگہ تحقیق سے متعلق اپنی گزشتہ آراء کو سرسری جائزے کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے نیز اپنی رائے میں واقع ہونے والے تزلزل کا اعتراف کرتے ہوئے فاضل مصنف یوں رقم طراز ہوئے ہیں:

"۔۔۔زیر نظر جائزہ تحریر کرتے ہوئے پاکستان میں تحقیق کے معیار اور اسکی رفتار کے بارے میں جس بے اطمینانی کا اظہار اولاً کیا گیا تھا اس میں تزلزل واقع ہوتا رہا۔ مذکورہ تاثر ایک سرسری جائزے کا نتیجہ تھا۔"(۹)

سرسری مطالعات کو پیش کرنا اولاً تو خود دقیق تحقیقی روش پر سوالیہ نشان ہے۔ ثانیاً تحقیقی میدان کی طرف میلان رکھنے والے نو آموز اہل قلم کی پریشانی اور تضیعِ وقت کا سبب بنتا ہے۔ ثالثاً خود فاضل مصنف کی تحریروں اور کاوشوں کے اعتبار و استناد کو درجۂ قطع سے گرانے کا سبب بنتا ہے۔

ج: دقیق روشِ تحقیق

دقیق روشِ تحقیق کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی مصنف کے تحقیقی کام کے سلسلے میں جو رائے دی جائے وہ اصل حقائق کو پیش نظر رکھ کر نیز تعصبات و ذاتی تعلقات کے دائروں سے بالاتر ہو کر دی جائے۔ زیر بحث کتاب میں بعض مقامات پر یہ خامی نظر آتی ہے۔ مثلاً فگار دہلوی کے منتخب شائع شدہ کلام کی اغلاط کی تصحیح کے سلسلے میں فاضل مصنف نے لکھا ہے:

"محمد اکرام چغتائی نے ایک قلمی بیاض سے، جو کتب خانۂ پنجاب کے ذخیرۂ کیفی میں موجود ہے، فگار کا انتخاب کلام دریافت کر کے شائع کر دیا۔۔۔ اور اپنے مقدمے میں ان اغلاط کی نشاندہی کی ہے جو مختلف تذکرہ نگاروں۔۔۔۔ اسی کام کو گوہر نوشاہی نے بھی انجام دیا۔۔۔

غالباً ان دونوں محققین کو ایک دوسرے کے کاموں کی خبر نہ رہی۔ دونوں نے قریب قریب ایک ہی وقت میں یہ کام کیا۔"(۱۰)

اس ضمن میں حقیقت یہ ہے کہ فگار کا انتخاب کلام کتب خانۂ پنجاب میں سے اولاً ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے دریافت کیا تھا۔ اسی زمانے میں یہ کلام اکرام چغتائی کی نظر سے بھی گزرا۔ انھوں نے فوراً اسے نقل کر کے مرتب / تدوین کرنا شروع کیا۔ گوہر نوشاہی صاحب نے اسے روک دیا۔ چغتائی صاحب نے اسے راتوں رات مکمل کر کے سید وقار عظیم سے مقدمہ بھی لکھوا دیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اور دیگر محققین نے جب اسے دیکھا تو تقریباً اس میں ۳۰۰ کے قریب غلطیاں تھیں۔ فگار کا کلام مخطوطے کی شکل میں تھا چنانچہ اکرام چغتائی اسے درست نہ پڑھ سکے۔ مدیر "صحیفہ" کے اصرار پر ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ۱۰ غزلیں تصحیح کر کے شائع کروادیں اور اکرام چغتائی کا بھرم رکھنے کی خاطر کہا کہ ان کے نام کے ساتھ شائع نہ کریں۔ لہٰذا ڈاکٹر معین الدین عقیل کا یہ کہنا کہ دونوں محققین ایک دوسرے کے کام سے واقف نہ تھے، درست نہیں۔ علاوہ ازیں چغتائی صاحب فگار کا کلام پورا شائع بھی نہ کروا سکے۔ وہ فگار کے کلام کو درست پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ کہنا کہ ہم دونوں نے ایک ہی موضوع پہ کام کیا اور ایک دوسرے کے کام سے واقف نہ تھے، ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے دقیق تحقیق سے بے نیازی کی غمازی کرتا ہے۔(۱۱)

پاکستان میں اردو قواعد پر تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی کتاب "قواعدِ اردو" کا ذکر نہ کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔

د: مواد کی کثرتِ تکرار

تحقیق کا عمل خشک نہیں البتہ تحقیق کا مضمون بعض اوقات بعض لوگوں کے لیے خشک، کسل انگیز بنتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو قاری میں ذوقِ تحقیق کا نہ ہونا ہے اور دوسری وجہ تحقیقی کتاب کا اسلوب۔ بعض اوقات مصنف کی تحریر میں مواد کی تکرار بھی قاری / شائقینِ تحقیق میں اکتاہٹ کا سبب بنتی ہے۔ زیر بحث کتاب میں ایک جیسے مطالب اور ایک جیسے عناوین کی تکرار قاری / طالب علم کو اکتاہٹ سے دوچار کرتی ہے۔ کتاب میں تکرار کی نوعیت کئی طرح کی ہے۔ بعض مقامات پر پوری پوری سطر کی تکرار واقع ہوئی ہے۔ بعض مقامات پر پورے پیراگراف کی تکرار نظر آتی ہے۔ بعض جگہوں پر صفحے کے صفحے تکراری ہیں۔ بعض مقامات پر پیراگراف کی تکرار یوں ہوئی کہ پیراگراف کا صرف آخری جملہ بدلا ہے باقی پورا پیراگراف تکراری ہے۔

زیر نظر کتاب بنیادی طور پر مصنف موصوف کے مختلف اوقات میں چھپے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے ایک عمومی نوعیت کی تکرار مجموعی طور پر کتاب کے اول تا آخر نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کتاب کا قاری / طالب علم شدید قسم کی اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔ تکراری مواد اور اس کی صورتیں ملاحظہ کیجیے:

ا: مفہوم کی تکرار

مولانا محمد حسین آزاد پر ڈاکٹر محمد صادق نے اور پھر ڈاکٹر محمد اسلم فرخی نے تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس سلسلے میں جتنی معلومات فراہم کی ہیں ان میں مکمل طور پر مفہوم کی تکرار واقع ہوئی ہے۔ تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ صفحہ نمبر ۱۶۳، سطور نمبر ۶، ۵، ۴، ۱ پر مندرج مواد موضوع اور مفہوم دونوں اعتبار سے صفحہ نمبر ۱۶۴، سطور نمبر ۱۵، ۱۴، ۱۳ میں مکرر درج کیا گیا ہے۔ عبارت یہ ہے: ''محمد حسین آزاد کی تصانیف پر ڈاکٹر محمد صادق۔۔۔ شامل ہیں۔''(۱۲)

۲۔ صفحہ نمبر ۳۴، سطر ۵ تا ۱۴ پر درج شدہ مواد کی بھی موضوع اور مفہوم دونوں لحاظ سے صفحہ نمبر ۱۹۰، سطر نمبر ۸ تا ۱۸ میں تکرار نظر آتی ہے۔ عبارت یہ ہے: طیش نے اپنا کلیات۔۔۔۔۔ اردو کو اصل بتایا ہے۔ (۱۳)

ب: لفظی تکرار

متعدد مقامات پر پورے کے پورے جملوں، پیراگراف اور صفحات کی تکرار ایک لفظ کی کمی بیشی کے بغیر واقع ہوئی ہے مثلاً:

صفحہ نمبر	تکراری صفحات	تکراری سطور کی تعداد	تکراری مواد
۷ تا ۱۱	۱۷۳ تا ۱۷۸	۸۸	قیام پاکستان کے وقت تک۔۔۔۔ ڈاکٹر محمد ریاض کے نام ممتاز ہیں۔
۳۱	۱۸۷	۱۰	پروفیسر محمود شیرانی نے۔۔۔ نتائج تک پہنچے۔
۳۲	۱۸۸	۱۰	ڈاکٹر صاحب نے اس میں۔۔۔۔ ترقی پاتی رہی۔
۳۵/۳۶	۱۹۱/۱۹۲	۱۵	ڈاکٹر سہیل بخاری۔۔۔ حصہ مشترک ملتا ہے۔
۳۶/۳۷	۱۹۲/۱۹۳	۱۹	دوسری زبانوں سے اردو کی۔۔۔۔ تلاش و تحقیق کا منفرد

			ثبوت ہے۔
۳۹	۱۹۳	۱۴	اس نہج پر ایک کوشش۔۔۔کرنے کی کوشش کی ہے۔
۴۰	۱۹۴	۱۱	قدیم لغات میں۔۔۔روشنی ڈالی۔
۴۱/۴۲	۱۹۴/۱۹۵	۹	اردو کے ابتدائی ناموں۔۔۔تحقیقی کاوش ہے۔
۳۸۵	۳۸۵	۳	اردو زبان کے فروغ میں۔۔۔مصداق ہے۔

متذکرہ بالا جدول کو ملاحظہ کریں تو تکراری سطور کی تعداد ۱۷۹ بنتی ہے۔ لفظی تکرار کی کثرت نے ایک طرف تو تصنیف کی ضخامت میں بے جا اضافہ کیا ہے اور دوسری طرف کتاب کی قدر و قیمت اور قاری کی دلچسپی کو کم کرنے کا سامان کیا ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب میں یقیناً اپنی شبانہ روز کی عرق ریزی اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اردو تحقیق سے متعلق مواد فراہم کیا ہے۔ مواد کی کیفیت پر مواد کی تکرار نے غلبہ پایا ہے۔

غرض یہ کہ یہ کتاب اردو تحقیقی موضوعات و مسائل سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی تدریجی کاوش کا نتیجہ و مجموعہ ہے۔ اس میں شامل مقالات، مضامین اور تبصروں کا تصنیفی و اشاعتی وقت اور اِس وقت کے تقاضے اور تحقیقی معلومات رفتہ رفتہ بدلتی رہی ہیں۔ مکرّرات کا ایک بڑا سبب بھی یہی ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف عناوین پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہونے نیز کتاب میں ذکر شدہ کتب کے اندراج سنین میں سہویات، غیر یقینی رائے، مندرجہ کتب کے ناموں کے بعض الفاظ میں کمی بیشی اور مواد کی کثرتِ تکرار کی وجہ سے اس کتاب کی اصلیت (Orginality) کو ٹھیس پہنچی ہے۔ فاضل مصنف و محقق کی کاوش متذکرہ بالا تمام کمزوریوں، فروگزشتوں کے باوجود قابل تحسین و تعریف ہے۔ کاش کیا ہی اچھا ہو تا کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن کتابت کی اغلاط، مکرّرات کی کثرت اور سنین کی سہویات سے مبرّا ہونے کے بعد ہی چھپتا!

حوالہ جات

۱۔ معین الدین عقیل،ڈاکٹر،اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے،مقتدرہ قومی زبان پاکستان،اسلام آباد، طبع اول ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۲، سطر ۲۰

۲۔ ایضاً، ص ۱۴۷، سطر ۷

۳۔ ایضاً، ص ۳۶۴، سطر نمبر ۷

۴۔ ایضاً، ص ۳۸۲، سطر ۱۸

۵۔ معین الدین عقیل،ڈاکٹر، پاکستانی زبان وادب مسائل و مناظر، وقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۴۴۳، سطر ۳

۶۔ معین الدین عقیل،ڈاکٹر، اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے، ص ۱۶۸، سطر نمبر ۷/۶

۷۔ ایضاً، ص ۱۶۹، سطر ۲۱/۲۰

۸۔ ایضاً، ص ۲۴۲، سطر ۱

۹۔ ایضاً، ص ۱۶۸، سطر ۳ تا ۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۹، سطر ۸ تا ۱۳

۱۱۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، پی ایچ ڈی کلاس لیکچر، ۲۹ اپریل ۲۰۰۹، سہ پہر ۳ بجے، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۱۲۔ معین الدین عقیل،ڈاکٹر، اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے، ص ۱۶۴، سطر نمبر ۱۵، ۱۴، ۱۳ اور صفحہ ۱۶۳، سطر ۶، ۵، ۴، ۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۴، سطر ۵ تا ۱۴ اور صفحہ ۱۹۰، سطر نمبر ۸ تا ۱۸

کلامِ فیض کا سماجی تناظر

The Social Context of Faiz's Poetry

ڈاکٹر نعیم مظہر* / ڈاکٹر عثمان غنی رعد**

Abstract:

Faiz Ahmed Faiz's poetry holds a unique place in Urdu poetry, which presents a beautiful blend of social consciousness and human emotions. His poems not only highlight intellectual and emotional aspects but also are a strong protest against social inequality, oppression, oppression, and deprivation. Social conditions, class struggle, and feelings of human freedom have a prominent place in Faiz's poetry.Faiz's poetry is connected to the political and social environment of his era. Through his poems, he criticized colonial domination, imperial tyranny, and the oppression of the capitalist system. His creative expression not only became a voice for the oppressed classes but also presented the dream of a better and just society.The aesthetic characteristics of Faiz's poetry are also a reflection of his social views. He linked love and revolution with each other, giving his poetry a unique universal color. His poems and ghazals, such as "Bol Ke Lab Azad Hain Tere" and "Hum Dekhenge", are not only literary masterpieces but also a source of inspiration for social movements.The social context of Faiz's poetry highlights the importance of his ideas, aesthetic expression, and human struggle, which gives him a unique place in Urdu literature. The social impact of his poetry is felt even today and inspires readers

*ایسوسی ایٹ پروفیسر، نمل، اسلام آباد

**استاد شعبہ اُردو، نمل، اسلام آباد

to rise up against oppression and oppression.

Keywords: Society, humanity, people, Faiz Ahmed Faiz, politics, communism, Marxism, Urdu poetry,

کلیدی الفاظ: سماج، انسانیت، عوام، فیض احمد فیض، سیاست، کیمونزم، مارکسزم، اردو شاعری، حساسیت، طبقاتی کشمکش، انصاف

سماج انسانی روابط، ثقافت، اقدار اور رسم و رواج کا مجموعہ ہوتا ہے، جہاں افراد ایک دوسرے کے ساتھ مختلف تعلقات استوار کرتے ہیں۔ سماجیات وہ علم ہے جو سماجی ڈھانچے، اداروں، رویوں اور انسانی تعلقات کا سائنسی مطالعہ کرتا ہے۔ یہ علم ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ معاشرتی عوامل افراد کی زندگی، سوچ، اور عمل پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ سماج اور سماجیات کا تعامل اس وقت وجود میں آتا ہے جب ہم سماجی اصولوں، نظریات اور انسانی تعلقات کو ایک مخصوص فریم ورک میں دیکھتے ہیں۔ ایک متحرک سماج ہمیشہ تغیر پذیر ہوتا ہے، اور سماجیات ان تبدیلیوں کا مشاہدہ، تجزیہ اور وضاحت فراہم کرتی ہے۔ یہی تعامل ہمیں سماجی انصاف، ترقی، اور اصلاحات کی راہ دکھاتا ہے، جو کسی بھی معاشرتی ڈھانچے کی بہتری کے لیے ضروری ہیں۔

شاعر اپنے سماج کا حساس ترین فرد ہوتا ہے جو اپنے ماحول میں ہونے والے واقعات، مسائل، اور اجتماعی احساسات کو گہرائی سے محسوس کرتا ہے۔ وہ سماج کے دکھ درد، ناانصافی، طبقاتی کشمکش، جبر، اور انسانی جذبات کو اپنی شاعری میں اس لیے سمو دیتا ہے تاکہ نہ صرف ان مسائل کی نشاندہی کرے بلکہ قارئین کے دلوں میں بیداری اور شعور پیدا کر سکے۔ شاعری محض الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ ایک فکری تحریک ہوتی ہے جو انسانی جذبات کو جھنجھوڑتی اور سماجی تبدیلی کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں امتِ مسلمہ کے زوال کا نوحہ ہو یا فیض احمد فیض کی نظموں میں جبر کے خلاف احتجاج، یہ سب شاعر کے اس جذبے کی عکاسی کرتے ہیں جو اسے اپنے عہد کے مسائل کو شعری پیکر میں ڈھالنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح، شاعر اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج کی آواز بن کر نہ صرف ماضی اور حال کا آئینہ دکھاتا ہے بلکہ مستقبل کے امکانات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

فیض احمد فیض کا کلام اردو شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے، جو سماجی شعور اور انسانی جذبات کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ ان کے اشعار نہ صرف فکری اور جذباتی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ سماجی نابرابری، ظلم، جبر اور محرومی کے خلاف ایک مضبوط احتجاج بھی ہیں۔ فیض کی شاعری میں معاشرتی حالات، طبقاتی کشمکش، اور انسانی آزادی کے جذبات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

فیض کی شاعری اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی ماحول سے جڑی ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعے نو آبادیاتی تسلط، سامراجی استبداد، اور سرمایہ دارانہ نظام کے جبر کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کا تخلیقی اظہار نہ صرف مظلوم طبقات کے لیے آواز بنا بلکہ ایک بہتر اور عادلانہ معاشرے کے خواب کو بھی پیش کرتا ہے۔

فیض کی شاعری کی جمالیاتی خصوصیات بھی ان کے سماجی نظریات کی عکاس ہیں۔ انھوں نے محبت اور انقلاب کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے اپنی شاعری کو ایک منفرد آفاقی رنگ دیا۔ ان کی نظمیں اور غزلیں، جیسے "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" اور "ہم دیکھیں گے"، صرف ادبی شاہکار نہیں بلکہ سماجی تحریکوں کے لیے تحریک کا ذریعہ بھی ہیں۔

کلامِ فیض کا سماجی تناظر ان کے نظریات، جمالیاتی اظہار، اور انسانی جدوجہد کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے، جو اردو ادب میں انھیں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ان کی شاعری کا سماجی اثر آج بھی محسوس کیا جاتا ہے اور یہ قارئین کو ظلم و جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تحریک دیتی ہے۔

فیض کے ہاں شروع سے ہی دنیا اور سماج کی الجھنوں کا ذکر ملتا ہے اور انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سماج کے کس پہلو کا ذکر کرنا چاہتے ہیں؛ان کی نظم "سرود"میں ذات کی گمشدگی اور سماجی بے چینی، سماجی تبدیلی اور تقدیر پر بھروسہ، سماجی جدوجہد اور امید، سماجی بیداری اور اتحاد، محبت اور سماجی امید جیسے موضوعات اہم ہو جاتے ہیں۔ نظم کے دو اشعار دیکھیے:

موت اپنی نہ عمل اپنا نہ جینا اپنا
کھو گیا شورش گیتی میں قرینہ اپنا
عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی
گرم رکھ آتش پیکار سے سینہ اپنا(۱)

یہ اشعار سماجی بے چینی، قیادت کی کمی، سماجی تبدیلی، جدوجہد، بیداری، اور امید کی بات کرتے ہیں۔ شاعر نے اس نظم کے ذریعے سماجی مسائل کو اجاگر کیا ہے اور ان کے حل کے لیے محبت، اتحاد، اور جہد و کوشش کی طرف رہنمائی کی ہے۔ یہ اشعار صرف فرد کی ذات تک محدود نہیں، بلکہ پورے سماج کی عکاسی کرتے ہیں، جو آج کے دور میں بھی اتنے ہی متعلقہ ہیں۔ فیض فرد کی سماجی بے چینی اور گمشدگی کو بیان کرتا ہے۔ آج کے دور میں انسان اپنی شناخت، اپنے مقصد، اور اپنے وجود کو کھو چکا ہے۔ سماجی شورش، سیاسی انتشار، اور معاشرتی بے راہ روی نے فرد کو اپنے آپ سے دور کر دیا ہے۔ مندرجہ بالا اشعار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان سماجی دباؤ اور تیزی سے

بدلتی ہوئی دنیا میں اپنا توازن کھو چکا ہے۔ فیض اس سے آگے بڑھ کر سماجی جدوجہد اور امید کی بات کرتا ہے۔ دنیا کے ہنگامے (فسادات، مشکلات) خواب کی طرح ہو سکتے ہیں، لیکن انسان کو اپنے سینے کو آتش پیکار (جہد و کوشش) سے گرم رکھنا چاہیے۔ شاعر سماجی تبدیلی کے لیے محنت اور کوشش کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

گوپی چند نارنگ نے فیض کے ہاں الفاظ کی بندش و نشست کی سماجی معنوی حیثیت پہ جو بات کی ہے وہ نظم "طوق و دار کا موسم" کے حوالے سے بتاتے ہیں، جسے وہ نظم نما غزل بھی کہتے ہیں۔ پہلے نظم کے دو اشعار دیکھیے:

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجران یار کا موسم
یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم(۲)

اس نظم میں بھی فیض کے ہاں شدت سے سماجی تبدیلی کی خواہش اور ایک خاص جبر کا اندازہ ہوتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیض کے ہاں سماجی بے چینی اور تبدیلی کی توقع، معاشی دباؤ اور سماجی آزمائش، محبت اور سماجی خوشی، سماجی تفریح اور قدرتی حسن، سماجی اتحاد اور خوشی، جدائی اور سماجی دکھ، سماجی جبر اور اختیار، سماجی قید اور آزادی، سماجی آزادی اور بہار اور سماجی امید اور مستقبل کی فکر جیسے موضوعات پنپتے ہیں۔ اسی حوالے سے جو گوپی چند نارنگ نے کہا تھا دیکھیے:

> "یہاں انتظار کا موسم یا بہار کا موسم، رومانی شاعری سے ہٹ کر ایک الگ سماجی سیاسی معنیاتی نظام رکھتے ہیں۔ طوق و دار کی رعایت سے اب جنوں، حب الوطنی، سامراج دشمنی یا عوام دوستی کی ترجمانی کرتا ہے، جبر و اختیار کے معنی کی بھی تقلیب ہو گی ہے۔"(۳)

سب کچھ فیض نے ایک قالب میں اکٹھا کر دیا ہے۔ حسن، زندگی، محبت اور انقلاب ایک سانچے میں ڈھال کر بیان کر دیا ہے۔ یہی بڑے شاعر کی فکر اور موضوعات سے اسلوبیات کی تشکیل کا انداز ہوتا ہے۔

فیض کی ساری شاعری میں سماج پر ٹوٹنے والے المیوں، آزمائشوں اور تکالیف کا ذکر ملتا ہے اور وہ اپنی نظموں میں اس پر کھل کر لکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ ان کی نظم "صبحِ آزادی" اس طرز پر ایک بہترین مثال ہو سکتی ہے۔ نظم کے چند اشعار دیکھیے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی(۴)

اس نظم سے اس آزادی کے دور کی تڑپ اور پھر ایک مایوسی کا ذکر سماجی سوچ کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے، لہذا اس میں آزادی کی ناکامی اور مایوسی کا بیان ہے۔ امید اور جدوجہد کا درس اور اشارے بھی ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس نظم میں سماجی سطح کے بہت سے نظریات جیسے؛ سماجی انتشار اور بے چینی، نوجوانوں کی قربانی، محبت اور سماجی تعلقات، سماجی تبدیلی کی امید اور سماجی بیداری اور عمل دکھائی دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ نظم تقسیم ہند کے بعد کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کی عکاسی کرتی ہے۔ فیض نے اس نظم میں آزادی کی ناکامی، مایوسی، امید، جدوجہد اور سماجی تبدیلی کے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ یہ نظم نہ صرف ایک تاریخی واقعے کی عکاسی کرتی ہے، بلکہ اس میں آج کے دور کے سماجی مسائل کی طرف بھی اشارہ ہے۔ فیض کی شاعری ہمیشہ سماجی انصاف، انسانی حقوق، اور امید کی بات کرتی ہے اور یہ نظم بھی انہی اقدار کی ترجمانی کرتی ہے۔

فیض کے سماجی شعور اور تناظر کے بارے میں ڈاکٹر سید جعفر احمد لکھتے ہیں:

> "فیض کی شاعری میں آزمائشوں اور المیوں کا اور انسان پر ٹوٹنے والی آفتوں کا بڑا ذکر ہے۔ بڑی دردناک فضائیں اُن کی نظموں میں چھائی رہتی ہیں__ "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر"، "کڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں"، "کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ"۔ یہ سب اُن کی شاعری میں ہے لیکن پھر یہ سندیسے بھی ہیں کہ "ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے"، "سب تاج اچھالے جائیں گے"، "سب تخت گرائے جائیں گے"، "اٹھے گا اناالحق کا نعرہ جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو، اور راج کرے گی خلقِ خدا جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو"۔ فیض کا تاریخی اور سماجی شعور اُن کو یقین کی اس دولت سے بھی ہم

کنار کرتا ہے۔"(۵)

فیض احمد فیض کی شاعری کے مختلف جہات کو بیان کیا گیا ہے۔ فیض کی شاعری محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک گہری معنویت کی حامل ہے جو انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے۔ انہیں انسانیت کے ضمیر کی آواز کہا گیا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کی شاعری صرف ایک ادبی اظہار نہیں بلکہ ظلم و جبر کے خلاف ایک توانا احتجاج بھی ہے۔ ان کی شاعری نفری بھی ہے اور للکار بھی، یعنی وہ صرف حالات کی تلخی کو بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ظلم کے خلاف کھل کر آواز بھی بلند کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سوزِ یقین بھی ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ حق و سچائی پر یقین رکھتے ہیں اور ایک بہتر معاشرے کی امید کو زندہ رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے کلام میں غمِ زمانہ کا درد بھی شامل ہے، جو مظلوم طبقے کے دکھوں کو اجاگر کرتا ہے اور ان کی جدوجہد میں شامل ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ فیض کی شاعری میں جہد و انقلاب کی گھن گرج بھی ہے، جو اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ محض غم کے شاعر نہیں بلکہ ایک انقلابی فکر کے حامل ہیں۔ ان کی شاعری میں مزاحمت اور انقلاب کا پیغام ملتا ہے، جو محکوم و مظلوم طبقے کو بیدار کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، فیض کے کلام میں حسن و محبت کی شیریں نوائی بھی پائی جاتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی شاعری صرف احتجاجی یا سیاسی نہیں بلکہ جمالیاتی حسن اور محبت کے جذبات سے بھی لبریز ہے۔ سید سبطِ حسن نے اسی لیے اور بجا طور پر فیض کو دور حاضر میں جو انقلابی اور ضمیر کی آواز کہا ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے اور معزرے کے غم زدہ لوگوں اور بے سہاروں کی آواز بھی تھے۔ اقتباس دیکھیے:

> "فیض احمد فیض دور حاضر میں دکھی انسانیت کے ضمیر کی آواز میں ایسی آواز جو نفری بھی ہے للکار بھی جس میں سوز یقیں بھی ہے اور غم زمانہ کا درد بھی جہد و انقلاب کی گھن گرج بھی ہے اور حسن و محبت کی شیریں نوائی بھی۔"(۶)

دیا گیا اقتباس فیض احمد فیض کے فکری اور ادبی مقام کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ وہ صرف ایک شاعر نہیں بلکہ ایک سماجی رہنما اور انسانیت کے ترجمان تھے، جن کی شاعری آج بھی ظلم کے خلاف کھڑی ہونے والے ہر فرد کے لیے ایک مشعلِ راہ ہے۔

فیض کے ہاں ہمیشہ ہی استحصالی معاشرے کے خلاف آواز اس طور بلند ہوتی ہے کہ صاف پتا چلتا ہے کہ عوام دوست شاعر اپنے عوام کو پکار رہا ہے، ان کے حقوق کی آواز اٹھا رہا ہے۔ استحصالی نظام وہ سماجی اور معاشی ڈھانچہ ہے جہاں طاقتور طبقات کمزوروں کے حقوق کو سلب کر کے اپنی بالادستی قائم رکھتے ہیں۔ ایسے نظام میں ایک انسان

دوست شاعر کی عظمت اس کی فکری بلندی اور سماجی شعور میں مضمر ہوتی ہے، کیونکہ وہ جبر، ناانصافی، اور استحصال کے خلاف نہ صرف آواز بلند کرتا ہے بلکہ اپنے الفاظ کے ذریعے عوامی بیداری کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ وہ مظلوموں کی ترجمانی کرتا ہے، ان کے خوابوں اور دکھوں کو اپنی شاعری میں بیان کر کے ایک ایسا بیانیہ تخلیق کرتا ہے جو ظالموں کے لیے ایک چیلنج اور محکوموں کے لیے امید بن جاتا ہے۔ اس کا کلام محض خوبصورت الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا انقلابی منشور ہوتا ہے جو ذہنوں کو جھنجھوڑنے اور دلوں میں بغاوت کی چنگاری پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

انسان دوست شاعر کی عظمت اس بات میں ہے کہ وہ صرف خوبصورتی اور جذبات کے اظہار تک محدود نہیں رہتا، بلکہ ظلم اور بربریت کے خلاف عملی جدوجہد میں بھی شامل ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو استحصالی قوتوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے اور ایک ایسے سماج کا خواب دیکھتا ہے جہاں انصاف، برابری، اور محبت کو بنیادی اہمیت حاصل ہو۔ اس کی شاعری محروم طبقے کو یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ بے یار و مددگار نہیں ہیں، بلکہ ان کے دکھ درد کو محسوس کرنے والا ایک حساس دل رکھنے والا شاعر ان کے ساتھ کھڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استحصالی نظام ہمیشہ ایسے شعرا سے خوفزدہ رہتا ہے اور ان کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ سچائی کی طاقت ہمیشہ ظلم پر غالب آتی ہے اور انسان دوست شاعر کا کلام ہر دور میں زندہ رہتا ہے۔ اسی تناظر میں پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> "وہ استحصالی نظام میں انسان دوستی کے مسلک پر پر عوام دوستی کے آدرش کو ترجیح دیتا تھا اور برملا کہتا تھا کہ ہر چند جاگیر دار اور سرمایہ دار بھی انسان کے ذیل میں آتا ہے مگر وہ اس کی ہمدردیوں کا حق نہیں ہے۔"(۷)

عوام دوستی اور معاشرتی و سماجی تناظر میں گناہ کی ڈگر پہ چلنے والے کسی بھی شخص کو انسان سمجھتے ہوئے بھی اعراض کر گزرنا، یہ فیض ہی کا کرشمہ ہے اور اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ ہے مظلوم سماج کی حمایت۔

فیض احمد فیض کی شاعری میں سماجی انصاف، انسانی حقوق، محبت، امن، خواتین کے حقوق، اور انقلاب جیسے موضوعات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے خواہاں تھے جہاں انصاف، مساوات، اور محبت کا دور دورہ ہو۔ ان کی شاعری نہ صرف جمالیاتی حسن سے لبریز ہے، بلکہ اس میں سماجی بیداری اور انسانی اقدار کا گہرا شعور بھی پایا جاتا ہے۔ فیض کی شاعری آج بھی سماجی تبدیلی اور انسانی حقوق کی جدوجہد کے لیے ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری محض جمالیاتی اظہار نہیں بلکہ ایک فکری اور سماجی بیانیہ ہے،

جس میں انہوں نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، اور معاشی حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کی شاعری میں سماج کے مختلف پہلو نمایاں ہیں، جو نہ صرف اس وقت کے مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ آج بھی ہمارے معاشرتی حالات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ظلم، جبر اور استحصال، طبقاتی تقسیم اور معاشی ناہمواری، آزادی اور انقلاب، محبت اور انسان دوستی، امید اور مزاحمت کے ساتھ ساتھ فیض احمد فیض کی شاعری محض الفاظ کا خوبصورت اظہار نہیں بلکہ ایک مکمل سماجی بیانیہ ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم اپنے معاشرتی، سیاسی، اور اقتصادی حالات کو دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف ظلم اور استحصال کے خلاف آواز اٹھائی بلکہ امید، انقلاب، اور ایک بہتر سماج کا خواب بھی دکھایا، جو آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۴۶

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۳۔ گوپی چند نارنگ، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ایڈشاٹ پبلی کیشنز، ممبئی، ۲۰۰۴، ص ۱۶۷

۴۔ نسخہ ہائے وفا، ص ۱۱۶

۵۔ https://jang.com.pk/news/845346 ۱۳ تاریخ: فروری، ۲۰۲۵ بہ وقت: ۱۲:۴۵ دوپہر

۶۔ سبطِ حسن، سید، فیض کا آدرش، مشمولہ؛ فیض احمد فیض (فیض صدی: منتخب مضامین)، یوسف حسن، پروفیسر، روش ندیم، ڈاکٹر (مرتبین)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰، ص ۵۷

۷۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، لیلائے وطن، مشمولہ؛ فیض احمد فیض (فیض صدی: منتخب مضامین)، ص ۱۰۰

خلیل طوق آر کا اسلوبِ شاعری

The Poetic Style of Dr. Halil Toqar

میمونہ ریاض* / ڈاکٹر صدف نقوی**

Abstract:

Dr. Halil Toqar is not only a researcher, critic, travelogue writer, translator, and educationist, but also a poet who expresses beautiful emotions through his poetry. He has published three poetry collections titled "Ek Qatra Aansoo" (A Drop of Tear), "Aakhri Faryaad" (The Final Plea), and "Pardesi" (The Foreigner). He began his literary journey with poetry and has carried out significant scholarly work on Mirza Ghalib and Bahadur Shah Zafar. Hence, the influence of these two literary figures is clearly visible in his thoughts and ideas.

Dr. Toqar started his poetic expression with Nazm (a form of Urdu poetry) and explored all its forms. The tone and style of his nazms are somewhat distinct from conventional Urdu poetry, and some of his poems bear resemblance to Turkish poetic traditions. His poems are rich in deep meaning, infused with emotion and imagination, and marked by sensitivity. Spontaneity is a prominent feature of his work. He conveys heartfelt sentiments in simple, direct language.

Renowned poet Satyapal Anand has described him as the "Albela Shaayar" (the unique poet) of Urdu. An evolutionary process is evident in Halil Toqar's poetry—he began with nazm, later ventured

*ایم۔فل اسکالر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

**صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

into ghazals, and also expressed his devotion through Hamd (praise of God) and Naat (praise of the Prophet Muhammad, PBUH). His poetry reflects the classical elegance of the Urdu language. His creative abundance, simple yet fluent use of vocabulary and expressions are hallmarks of his art.

Due to his broad observation of life, diverse themes are molded into the form of his poetry. He believes in the concept of literature for life. With a deep awareness of the global landscape, his poetry touches on a range of subjects—social, political, and romantic. A significant portion of his work is composed of resistance poetry. Halil Toqar is a natural poet and a valuable asset to Urdu literature.

خلیل طوق آر ایک محقق، نقاد، سفر نامہ نگار، ماہر مترجم اور تعلیم و تدریس سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت جذبوں کے شاعر بھی ہیں۔ اُن کے تین شاعری مجموعے "ایک قطرہ آنسو"، "آخری فریاد" اور "پردیسی" منظر عام پر آچکے ہیں۔ اِن کی شاعری اِن کے لطیف جذبات واحساسات کی عکاس ہے۔

خلیل طوقار نے لکھنے کا آغاز شاعری سے کیا۔ آپ نے مرزا غالب اور بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے بڑا وقیع تحقیقی کام کیا ہے۔ لہٰذا ان دو شخصیات کا اثر اِن کے افکار و نظریات میں نمایاں ہے۔ شاعری کا آغاز نظم نگاری سے کیا اور نظم کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اُن کی نظم کا آہنگ واسلوب عام اُردو نظم نگاری سے قدر مختلف ہے۔ اُن کی کچھ نظموں کا اسلوب ترکی زبان کی شاعری کے اسلوب کے قریب ہے۔ اُن کے مجموعہ کلام "ایک قطرہ آنسو" کی نظم کی چند سطور دیکھیے:

ایک قطرہ پانی کا ہوں میں
نہ بو ہے میری، نہ ہے رنگ میرا
لاتعداد ہم جنسوں کے بیچ میں ہوں
مجذوب![1]

خلیل طوقار کی یہ نظم انسان کی دلی کیفیات کی عکاس ہے اور گہری معصومیت کی حامل ہے۔ ان کی شاعری میں جذبہ ہے تخیّل ہے۔ اِن کی شاعری بزم آرائی کے لیے نہیں بلکہ مدعّا نگاری کے لیے ہے۔ وہ شاعری کو اپنے جذبات، خیالات اور احساسات کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

"خلیل طوقار کی اِس شاعری مجموعے میں اس انسان کی تلاش کا عمل دیدنی ہے کہ جو مادیّ دنیا کے اندھیروں میں کہیں گم ہو چکا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کی شعری روایات کا ایک حصہ محمد عاکف کی شاعری سے نسبت رکھتے ہوئے مولانا روم کے انسانی تصورات سے ہم آہنگ ہوتا نظر آتا ہے۔"(۲)

خلیل طوقار کی شاعری میں بے ساختہ پن ہے یہی وجہ ہے کہ اِس میں پیچیدگی، بناوٹ اور تصنّع نہیں ہے۔ سیدھے سادھے الفاظ میں دل کی بات بیان کر دیتے ہیں ستیہ پال آنند ڈاکٹر خلیل طوقار کو اردو کا البیلا شاعر قرار دیتے ہیں:

"ڈاکٹر خلیل طوقار صاحب کے پہلے مجموعہ "ایک قطرہ آنسو" میں مشمولہ نثری نظمیں اُن کے دل سے نکلی ہوئی، شبنم سے دُھلی ہوئی، ایسی شاعری ہے جسے لوئی میکنیس Honest to God and Self کہتا ہے۔"(۳)

ڈاکٹر خلیل طوقار کی شاعری جذبات سے عبارت ہے نثری موضوعات میں تنوع اور رنگا رنگی دکھائی دیتی ہے۔ لگے بندھے موضوعات سے ہٹ کر بات کرتے ہیں عشقیہ رنگ بھی شاعری میں نظر آتا ہے:

تیرے گلاب رنگ
معصوم چہرے پر
عشق کی چمک دیکھ کر
ہم تو مر گئے
کھلے کالے بالوں کی
زنجیروں میں
آزادی کو پا کر
ہم تو مر گئے(۴)

خلیل طوقار کی نظموں میں محبت، عقیدت، لگن، ہمدردی، نفرت، پرستش زندگی کے ہر رنگ کا تخلیقی اظہار نظر آتا ہے۔ تخلیقی وفور کے اظہار کے لیے اُنھوں نے آزاد نظم کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر ضیا الحسن لکھتے ہیں:

"خلیل طوقار یقیناً ترکی زبان کے بہترین شاعر ہوں گے کیوں کہ اُن کی اُردو شاعری صاف پتہ دیتی ہے کہ وہ ازل سے شاعر کا دل دماغ لے آئے ہیں۔ اُنھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔

لیکن اُن کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کو نظم کے زاویے سے زیادہ تخلیقی انداز میں دیکھنے پر قدرت رکھتے ہیں اُن کی شاعری ہمیں جس تخلیق کار سے متعارف کراتی ہے وہ خدا پرست، انسان پرست اور اقدار پرست انسان ہے۔"(۵)

خلیل طوقار کی شاعری میں تین زبانوں ترکی، اُردو اور فارسی کا رس نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں موضوعاتی اور اسلوبی دونوں حوالے سے جدت نظر آتی ہے۔ اُن کی نظم "ڈرتا ہوں" دیکھیے:

میری جان کہنے سے
ڈرتا ہوں تجھ کو
میری عمر کتنی ہے
یہ نہیں معلوم
دل کی دھڑکن کہنے سے
ڈرتا ہوں تجھ کو
دل کو کب رُکنا ہے
یہ نہیں معلوم
میری روح کہنے سے
ڈرتا ہوں تجھ کو
میری روح کو چین نہیں
یہ مجھے معلوم نہیں!(۶)

خلیل طوقار کی شاعری عصر حاضر کی ترجمان ہے۔ "آج پھر نیا سال آیا" نظم اُن کے نزدیک ذمہ داریوں اور اداسیوں سے عبارت ہے:

آج پھر نیا سال آیا
ایک دن اور کٹ گیا میری زندگی سے
ایک پتا اور سوکھ کر گر پڑا عمر کے پیڑ سے
ایک دن اور بڑھ گیا جدائی کی مہلت میں
ایک بوجھ اور لادا گیا میرے لاچار کندھوں پہ

ایک اور پھول ٹوٹا اُمیدوں کی شاخ سے
ایک رات اور بیت گئی گنتی کی راتوں سے
ایک اور شمع بجھ گئی دل کی تاریکیوں سے
آج پھر نیا سال آیا(۷)

ڈاکٹر خلیل طوقار کا پہلا مجموعہ کلام "ایک قطرہ آنسو" نظموں پر مشتمل ہے۔ لیکن اُن کا دوسرا مجموعہ کلام "آخری فریاد" میں نظمیں اور غزلیات دونوں شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں "اپنی بات" کے عنوان سے عنوان کتاب کی توجیہ یوں پیش کرتے ہیں:

"یہ اُردو میں میرا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس مجموعے میں بھی میرے پہلے والے مجموعہ کلام "ایک قطرہ آنسو "کی طرح اپنے ایک دل کی باتیں اپنے انداز میں اپنے پیار کی زبان کی وساطت سے قارئین کرام کی خدمات میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بالکل" ایک قطرہ آنسو" کی طرح اس مجموعہ میں بھی میری زندگی کی کچھ خوشیوں اور زیادہ تر غم کا بیان موجود ہے اور اس مجموعہ میں بھی میری اُداسی کا سفر جو رواں دواں ہے کہ کچھ لمحے، جنہوں نے مجھ سے یہ نظم لکھوائی ہیں، پائے جاتے ہیں۔ اس لیے میں اِس کو اپنی اداسی کا سفر کہہ لوں تو بجا ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اس مجموعہ کا نام "آخری فریاد" رکھا ہے۔ ویسے بھی انسان کی ہر فریاد آخری فریاد ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ ایک اور فریاد کے لیے اُس کے پاس وقت ہے کہ نہیں، اس بات کا کسی کو علم نہیں! دراصل میں نے یہ سوچتے ہوئے اس مجموعہ کا نام" آخری فریاد" رکھا تھا کہ یہ میری شاعری کی آخری کڑی ہو گی۔ تاہم تھوڑی دیر غور و فکر کے بعد یہ احساس ہوا کہ نہ زبان اور نہ ہاتھ میرے قابو میں ہیں۔ جب زبان چاہتی ہے تو بولتی ہے اور جب ہاتھ چاہتا ہے تو لکھتا ہے۔"(۸)

"آخری فریاد" کو خلیل طوقار نے پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصّہ اوّل کا عنوان غالب کے شعر کا پہلا مصرعہ "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں" ہے۔ حمد اور نعت کے بعد ۲۶ غزلیں ہیں دوسرے حصّے کا عنوان غالب کے شعر کا دوسرا مصرعہ "روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں" ہے۔

دوسرا حصّہ میں ۶۷ منظومات ہیں۔ حصّہ سوم "میرا نام ہے گم نام!" کے عنوان سے ہے۔ جس میں اسی عنوان سے نظم بھی شامل ہے۔ حصّہ چہارم "کچھ فارسی کلام" کے عنوان سے ہے۔ جس میں دو نظمیں ہیں۔ حصّہ پنجم

"خراجِ عقیدت" کے عنوان سے ہے۔ اطہر راز مرحوم اور ساحر شیوی نے خلیل طوقار کے لیے نظمیں کہی ہیں وہ اِس حصّہ میں شامل ہیں۔ خلیل طوقار کا یہ شعری مجموعہ موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کا المیہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

خلیل طوقار زندگی اور کائنات میں ترتیب اور حُسن ترتیب کو زندگی قرار دیتے ہیں اور زندگی کا مطالعہ بھی اسی نظم وضبط سے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ خلیل طوقار سماجی اقدار وروایات کے قائل ہیں۔ اُن کی شاعری میں اعلیٰ انسانی اقدار کی پیش کش نظر آتی ہے۔

خلیل طوقار نے اپنا راستہ خود منتخب کیا ہے بات واضح اور دوٹوک کرتے ہیں۔ کہیں کہیں علامتی پیرائیہ اظہار بھی نظر آتا ہے۔ نظموں میں تشبیہ واستعارہ کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر ضیاالحسن خلیل طوقار کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "خلیل طوقار کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جن کو بلا خوف وتردید اُردو کی اعلیٰ درجے کی نظموں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اُن کی ایک نظم کا عنوان ہے "نوع بشر کی رات" اپنے بنائے ضابطوں کا خوگر ذہن نوع انسان بل کہ بنی نوع انسان لکھنے پڑھنے کا عادی ہے۔"(۹)

نظم دیکھیے:

اندھیری رات کی گہرائی ہے،
اُلو بھی آنکھیں موند کر
بیٹھا ہے اِک نازک سی ڈالی پر
بے اطمینانی کے عالم میں
ڈرتا ہے آنکھ کھولنے سے
اُس کو شکار فراہم کرنے والے یہ اندھیرے
کہیں اُسے بھی اپنا شکار نہ بنالیں!
آج شب یلدا سے بھی لمبی رات ہے
کالی سیاہ، تاریکی کا راج ہے
کیوں کہ یہ اندھیرا
دلِ آدم کا سواد ہے

اور یہ رات
نوعِ بشر کی رات ہے
اس لیے آج دنیانامی اس جنگل میں
خوف وہراس کی گشت ہے!(۱۰)

خلیل طوقار کی شاعری روایت سے قریب ہے۔ آپ نے تین زبانوں کے کلاسیکی شعراء کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے تخلیقی وفور سے کسی کا رنگ بھی غالب نہیں آنے دیا۔ نظم ہو یا غزل دونوں اصناف سخن میں اُنھوں نے اپنا تشخّص برقرار رکھا ہے۔

خلیل طوقار کثیر الجہت شخصیت ہیں۔ شاعری ہو یا نثر، اُنھوں نے اپنی بنیادی شناخت کو برقرار رکھا ہے۔ غزل میں شاعر کو زیادہ باریکی اور فنی نزاکتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ خلیل طوقار نے اپنی فطری صلاحیت سے اپنے جذبات واحساسات کو نادر اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے:

سر جھکا کے جیتے ہیں، سر جھکا کے مرتے ہیں
ہر قدم پر ڈرتے ہیں، زیست اس کو کہتے ہیں
تجربے لحد کے سب درس تو ہیں عبرت کا
جاگنا ہے خوابوں سے ایک دن، یہ کہتے ہیں(۱۱)

خلیل طوقار نے چھوٹی بحر میں بھی طبع آزمائی کی ہے:

چراغ محبت بجھا کر گئے
مری زندگی کو چُرا کر گئے
خوشی کی توقع نہ کی تھی بہت
شب ور وز ظالم رُلا کر گئے(۱۲)

خلیل طوقار کے اس مجموعہ میں ہمیں پنجابی اور فارسی کے اشعار بھی دکھائی دیتے ہیں پنجابی کے اشعار دیکھیے:

نہ پھڑ مینوں مَیں آج یار وَل جانا اے
اوہندی راہ تے اپنا سر چھڈ جانا اے
زمانے نے آج تک اَزمایا مینوں

ہن میں زمانے توں، اَزمان جانا اے (۱۳)

فارسی قطعہ دیکھیے:

خوردم، مے خورد، نم آساں نبود
مردم وجاں کند نم آساں نبود
دل پریشان، چشم گریاں تادرش
رفتم وبر گشتم آساں نبود (۱۴)

اِن کی نظموں میں جو شعری تجربات ملتے ہیں اُنھوں نے خلیل طوقار کی بطور نظم نگار پہچان کو بنیادی شناخت بنا دیا ہے۔ اُن کا تخلیقی وفور اُن کی نظموں میں مصرع در مصرع اور خیال در خیال اپنی جگہ بناتا چلا جاتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر اشرف کمال لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر خلیل طوقار نظم کے حوالے سے ایک ایسے شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں کہ جن کے ہاں شعری موضوعات ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مختلف رنگوں پر مشتمل یہ جلوہ گری اس لیے بھی ہے کہ وہ بیک وقت کئی تہذیبوں کا مشاہدہ کرتے ہیں کئی قسم کے تجربات سے اُن کا واسطہ پڑتا ہے۔"(۱۵)

ڈاکٹر خلیل طوقار کا تیسرا شعری مجموعہ "پردیسی" ہے۔ اس شعری مجموعے کا انتساب اُنھوں نے ڈاکٹر ضیا الحسن کے نام کیا ہے۔ آپ کا یہ شعری مجموعہ پابند اور آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ خصوصاً اِن میں نثری نظموں کا رنگ نمایاں ہے۔ ڈاکٹر خلیل طوقار کے اِس مجموعے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"میری اس کتاب میں پابند نظموں سے زیادہ " بالکل آزاد نظمیں" ہیں۔ کیونکہ مجھے کسی صورت بھی گرفتاری پسند نہیں ہے۔ خواہ یہ زندگی کے کسی مرحلے میں ہو۔ خواہ نظم کے کسی مصرع میں اس لیے میں نظموں کی طرف، بالخصوص نثری نظم کی طرف، مائل رہتا ہوں۔ یہ میری مادری زبان ترکی کے جدید شاعری کے میلان کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔ علاوہ بریں چونکہ شاعری کے خوب صورت گھوڑے کے منہ میں لگام ڈال کر روک تھام کر کے اُسے خیالوں کے عالم میں سرعت کے کے ساتھ آگے بڑھنے سے روکنا میری ہمت کی بات نہیں لہذا میں کلاسیکل اصناف شاعری اور مصرّی وآزاد نظم کی نسبت نثری نظم میں طبع آزمائی کرنا پسند کرتا ہوں۔"(۱۶)

"اُردو زبان ایک ایسی شیریں اور پر اثر زبان ہے کہ ایک غیر زبان پر دیسی بھی اُس کی محبت میں شاعری شروع کر سکتا ہے۔"(۱۷)

ڈاکٹر خلیل طوقار کی مادری زبان ترکی ہے لیکن اُردو میں وہ بڑی روانی سے شاعری کرتے ہیں، زبانوں کے حوالے سے اُن کی ایک نظم دیکھیے:

دنیا کی تمام زبانیں ہیں پیاری
خواہ این ہندی باشد، خواہ فارسی
ہوے ایہہ اُدھ یا ترکی ہوئے کہ پنجابی
ہند کو نال وی محبت اے سانوں سندھی نال وی
بھاشا جو بھی ہو، ہے وہ ہماری(۱۸)

خلیل طوقار کی شاعری بے ساختگی سے عبارت ہے تصنّع، بناوٹ اور پیچیدگی نظر نہیں آتی، دل کی بات سیدھے سادے انداز میں کہنے کے قائل ہیں۔

سرور عالم راز سرور کہتے ہیں:

"خلیل طوقار اپنی نظموں میں ایک آزاد خیال اور فطری شاعر کی حیثیت سے بہت نمایاں ہیں۔ اُن کی شاعری کے مطالعہ کے دوران کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ارادی طور پر کسی مخصوص موضوع پر نظم کہنے بیٹھے ہیں، اُن کی بیش تر نظمیں سادہ، صاف اور اپنے قاری سے براہ راست مخاطب نظر آتی ہیں۔"(۱۹)

ان کی شاعری میں لطافت کے ساتھ نزاکت بھی ہے۔ مادری زبان ترکی ہونے کی وجہ سے اِن کی تشبیہات و استعارات میں نودرت دکھائی دیتی ہے۔ زبان و بیان پر عبور ہے۔ اسلوب میں تنوّع کا احساس ہوتا ہے۔ عصرِ حاضر کا تہذیبی شعور اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف کمال لکھتے ہیں:

"وہ اپنے اسلوب میں عصری صداقتوں کو سموئے ہوئے ہیں۔ وہ اُردو شاعری کرتے ہوئے اپنے ماحول سے بے خبر نہیں رہ سکتے۔"(۲۰)

اُن کی شاعری کا نمایاں ترین رنگ روانی ہے۔ یہ نظم دیکھیے:

ایک منزل طے کر کے
دوسری منزل تک

ایک سفر ہے میرا
شب و روز جاری

کیچڑ سے نکل کر
آسمان پار تک
ایک سفر ہے میرا
شب و روز جاری(۲۱)

خلیل طو قار کی شاعری میں ارتقائی عمل نمایاں ہے۔ آپ نے نظم نگاری سے سفر شروع کیا پھر غزلیں بھی لکھیں اور حمد و نعت کو اپنے عشق کا پیرائیہ اظہار بنایا۔ خلیل طو قار کی شاعری میں ہمیں اُردو زبان کی تہذیب نظر آتی ہے۔ تخلیق کا وفور اور لفظیات کا سادگی و رواں اظہار اُن کے فن کا خاصا ہے۔ وسیع مشاہدہ کی وجہ سے متّنوع موضوعات اُن کے شعری پیکر میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔

وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ عالمی منظر نامے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ تمام دنیا کے سفر بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس لے انہیں اپنے وسیع مشاہدے کی وجہ سے نئے نئے موضوعات ملتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں سیاسی، سماجی، رومانوی ہر طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ وہ ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا نمایاں حصّہ مزاحمتی شاعری پر مشتمل ہے خلیل طو قار فطری شاعر ہیں اور اُردو شاعری کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈضاً، خلیل طوق آر، ایک قطرہ آنسو، استنبول: مرکز تحقیقاتِ اُردو، ۱۹۹۹، ص ۱۶۰

۲۔ ڈاکٹر سعادت سعید: خلیل طو قار کی فکر انگیز شاعری، مشمولہ: ترک غمزہ زن، ترکی میں اُردو کا آہنی ستون، ڈاکٹر خلیل طو قار، حمیدہ شاہین، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵، ص ۱۱۱

۳۔ ستیہ پال آنند اردو کا ایک البیلا شاعر، مشمولہ: ترک غمزہ زن، ترکی میں اُردو کا آہنی ستون ڈاکٹر خلیل طوق آر، ص ۲۸

۴۔ خلیل طوق آر، آخری فریاد، لاہور: ملٹی میڈیا آفیسز، ۲۰۰۷، ص ۱۰۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۷۔ ڈاکٹر خلیل طو قار، ایک قطرہ آنسو، ص ۵۲

۸۔ خلیل طوق آر، آخری فریاد، لاہور: ملٹی میڈیا آفیسز، ۲۰۰۷، ص ۹

۹۔ خلیل طوق آر، آخری فریاد، ص ۱۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۹

۱۴۔ ایضاً ص ۱۵۷

۱۵۔ پروفیسر ڈاکٹر اشرف کمال، پاکستانی ادب کے معمار ڈاکٹر خلیل طو قار شخصیت و فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۲۲، ص ۶۰

۱۶۔ ڈاکٹر خلیل طو قار، پردیسی، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ ص ۱۴-۱۵

۱۷۔ ایضاً ص ۱۵

۱۸۔ ایضاً ص ۲۱۲

۱۹۔ سرور عالم راز سرور، ایک قطرہ آنسو، خلیل طو قار کے مجموعہ منظومات پر ایک نظر، مشمولہ: ترک غمزہ زن، ترکی میں اُردو کا آہنی ستون، ڈاکٹر خلیل طو قار حمیدہ شاہین، ۲۰۱۵، ص ۱۰۶

۲۰۔ ڈاکٹر اشرف کمال، پاکستانی ادب کے معمار، ڈاکٹر خلیل طوقار شخصیت اور فن اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۲۲، ص ۷۶

۲۱۔ ڈاکٹر خلیل طوقار، پردیسی، ص ۵۲

"نکلے تیری تلاش میں"(تجزیاتی مطالعہ)

Nikle Teri Talash men (An Analytical Study)

ناصرہ پروین* / ڈاکٹر سعید احمد**

Abstract:

Voyage remains the fate of man from beginning. The desire to know something is the specialty of human nature. The desire to find and explore is the instinctive fore that obliges the human race to keep evolving expedition in culture and civilization. Travelogues on the basis of their topic is an attractive declarative genre of literature, to which writing style of travelogue writes makes further alluring. History of travelogues writings in Urdu literature remains incomplete without discussing the travelogue writings of Mustansar Hussain Taarar. This Pakistani author has an eminent identity in the modern travelogue writings. Other than travelogue writings, he also made distinctive imprints in various genres like short story, novel and column. "Nikly Teri Talash Mein" (1972) was published from Sang-e-meil publications. This travelogue got an extraordinary place in Urdu literature. This travelogue is the initial travelogue of Tarrar, which was highly appreciated in the Urdu world. The level of its popularity was so high that from the start of its publication to 1978, in these fifteen years six addition of this travelogue were published. Based on 488 pages, this huge travelogue contains travel events of various Muslims countries other than Europe. He has divided this travelogue in 28 chapters. Tarrer comes out as a true tourist in this

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین لالیاں، چنیوٹ

** ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

travelogue. Like other Urdu travelogue writers, he didn't visit the foreign countries, to attend any literary program. Purpose of his journey was not other than tourism. Being a writer, he tries to grasp all the precious feelings. This travelogue depicts his internal and external emotions and feelings. He presented the cultural, political and social lives of these countries in an emotional way.

Keywords:
Urdu Travelogue, Mustansar Hussain Tarar, Niklay Teri Talash Mein, Cultural Representation, Tourism and Emotion, Modern Urdu Prose.

سفر روز اول سے ہی انسان کا مقدر رہا ہے۔ کسی چیز کو جاننے کی خواہش انسانی فطرت کا خاصا ہے۔ تلاش و جستجو کی خواہش وہ جبلی قوت ہے جو کہ نسل انسانی کو تہذیب و تمدن کا ارتقائی سفر جاری رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دست امکاں کو ایک نقش پا پایا(۱)

سفر نامہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک پُر کشش بیانیہ صنفِ ادب ہے جسے سفر نامہ نگار کا طرز نگارش مزید پُر کشش بنا دیتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید سفر نامہ نگاری کی بحث میں لکھتے ہیں:

"سرنامے کا شمار اُردو زبان کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے سفر نامہ چونکہ چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے اس لیے سفر کی اساسی شرط ہے"(۲)

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ماحول کی یکسانیت سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے اور اکتاہٹ کے اثر کو زائل کرنے کے لئے کسی نہ کسی تبدیلی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ تبدیلی کی یہ خواہش اسے آمادہ سفر کرتی ہے اور وہ نئے نئے مقامات کی سیر کرتے ہوئے اپنی بے زاری اور اکتاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ نئے نئے ملکوں کی تاریخ و جغرافیہ اور اقوام عالم کے اخلاق و عادات، رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش بھی انسان کو سفر کی جانب مائل کرتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"سفر میں تحیر کا عنصر فطری طور پر شامل نظر آتا ہے اور یہ تحیر انسان کو سفر پر اُکساتا رہتا ہے۔ سفر کی نوعیت خواہ کیسی ہو سیاح یا مسافر کے وابستگان اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ وہ

تجربات سفر سے زیادہ سے زیادہ آگہی حاصل کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔"(۳)

اُردو سفر نامے کی تاریخ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔ جدید اردو سفر نامہ نگاری میں ایک پاکستانی ادیب کی ایک منفرد شناخت ہے۔ انہوں نے سفر نامے کے علاوہ دیگر اصناف افسانہ، ناول، کالم میں بھی اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔

بقول سعید احمد:

"اس سفر نامہ نگار نے جدید سفر نامہ نگاری میں نئی جہتوں کا انکشاف کیا ہے۔"(۴)

"نکلے تیری تلاش میں" (۱۹۷۲ء) سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اس سفر نامہ کو اردو ادب میں اہم مقام حاصل ہوا ہے۔ یہ سفر نامہ تارڑ کا اولین سفر نامہ ہے۔ جو کہ اُردو دنیا میں بہت مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ اشاعت کے آغاز سے ۱۹۸۷ء تک ان پندرہ برسوں میں اس کے چھ ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۴۸۸ صفحات پر مشتمل اس ضخیم سفر نامے میں یورپ کے علاوہ کئی مسلم ممالک کی روداد سفر قلم بند ہے۔ انہوں نے سفر نامے کو اٹھائیس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ہر باب ایک افسانے کی حیثیت رکھتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

ارض میں خزاں، ہندوکش کے سائے میں، ہرائے، شہر بہزاد سے شہر خیام تک، نیلی شراب کی آبشار، نوع کا پہاڑ، بازنطائن قسطنطنیہ استنول، افریسیا کا صوفیہ کالسطنطائن کا آبی محل، اندھی بوڑھیا اور کبوتر، در فصیل ٹوٹ گئی، شہزادوں کے جزیرے، اورینٹ ایکسپریس، وئینس میں موت بھی خوبصورت ہے، ایس کے آسیب زدہ قصبے، فرینکوٹ کا کبڑا بوڑھا، مائک ملر بطخیں اور برلن، ایلبا کے کنارے، پریوں کا شہر، اوڈنزے، کوپن ہیگن کی دیوالی، جھیل چاندنی اور بار سنگھا، اسٹاک ہوم کی نیلی شفق، پھولوں کے دیس میں، ایک خوبصورت نظم ایمسٹرڈیم، نہریں اور زرد کلیاں، شہر بے مثال لنڈن، جھیل اور جزیرہ، اپاہج وینس دوسری طرف پاکستان تھا۔

مستنصر حسین تارڑ اس سفر نامے میں ایک حقیقی سیاح کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے اُردو کے دیگر سفر نامہ نگاروں کی طرح کسی ادبی پروگرام میں شریک ہونے کے لیے غیر ممالک کا سفر نہیں کیا تھا۔ ان کے سفر کا مقصد صرف سیاحت کے علاوہ کچھ نہیں تھا، ایک ادیب ہونے کی وجہ سے تمام نادر کیفیات کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ سفر نامہ ان کے داخلی اور خارجی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ انہوں نے ان ممالک کی تہذیبی، سیاسی، تاریخی، معاشرتی زندگی کو جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔

استنبول میں پہنچ کر حضرت ایوب انصاریؓ کے مرقد کو دیکھنے کا جذبہ، اور حضرت ایوب انصاریؓ کے حالات زندگی کے نادر واقعات کا بیان والہانہ اسلوب میں کیا ہے۔ سفر نامے کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

پوری اسلامی تاریخ و تہذیب نظروں کے سامنے ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کو اللہ کے رسول محمد ﷺ کی مہر رسالت کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنی باطنی اور جذباتی کیفیات کو والہانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

"چنانچہ میں علامتی نشانات دیکھتا ایک پرانے کمرے تک چلا گیا۔ اندر بالکل خاموشی تھی، کمرے کے وسط میں شیشے اور لکڑی کا ایک کیس دھراتا تھا، میں نے بلب کی ناکافی روشنی میں کیس کے اندر جھانکا، میرے ذہن نے احترام اور جذبے کی ایک ایسی معراج کو چھو لیا جو مجھ جیسے گنہگار کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی، میری روح کے دروں خانوں میں عقیدت کی ایک لہر اٹھی جس نے میری ہستی کو اپنے اندر سمو لیا، یہ میرے نصیب تھے کہ میں اپنی آنکھوں سے رسول اللہ ﷺ کی مہر رسالت دیکھ رہا تھا، حضور ﷺ کے مقدس ہاتھوں نے کتنی بار اسے چھوا ہو گا۔ مہر کے ساتھ حضور ﷺ کے ایک فرمان پر مہر کا نشان بھی تھا۔ اس کے علاوہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ کی تلواریں بھی اس کیس میں رکھی تھیں۔"(۵)

مستنصر حسین تارڑ نے ایک طرف اسلام کی تاریخ و تہذیب کی ورق گردانی کی ہے تو دوسری طرف استنبول کے خوبصورت مناظر کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے استنبول کے دلدوز اور دل کش مناظر سے لطف اندوز ہو کر اپنے احساسات، مشاہدات و جذبات کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

"میرے ذہن میں استنبول کی پہلی جھلک کے تاثرات ابھرے جو جوانی کی فریبوں اور پہلی محبت کی کنمناتی کسک سے زیادہ حسین اور ہیجان خیز تھے۔ اب چاہے میں کتنی بار ہی اس شہر میں کیوں نہ آؤں میرے احساسات میں وہ گرمی اور رفتگی نہ ہو گی۔۔۔ اسی طرح اگر مجھے بھی ایک نئی زندگی مل جائے تو میں استنبول کی پہلی جھلک کے احساسات سے روشناس ہونے کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔"(۶)

مستنصر حسین تارڑ اُردو کے دیگر سفر نامہ نگاروں سے قدرے مختلف ہیں۔ ایک آزاد خیال سیاح کی طرح ہاتھ میں دنیا کا نقشہ ساتھ لیے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں، جہاں کہیں راستہ جاننے میں دشواری پیش آئی، تھیلا سے نقشہ نکال کر اپنے آئندہ سفر کا پروگرام طے کر لیتے ہیں۔ ایک حقیقی سیاح کی طرح جہاں چاہا خیمہ گاڑ دیا اور رات بسر کر لی۔ کئی مرتبہ ان کو رات گزارنے میں پریشانیاں بھی پیش آئیں۔ جس کا اظہار سفر نامے میں بہت ہی چابکدستی سے کیا ہے۔ ظاہر ہے تارڑ کا یہ سفر ان کی شعوری کوشش کا نتیجہ تھا۔ سیاحت کے دوران اپنے مشاہدات،

تجربات اور احساسات کو سلسلہ وار لکھتے جارہے تھے، واقعات جس ترتیب سے پیش آئے اور سفر جس انداز میں طے ہوا، سفر نامہ نگار نے اس کا تاثر قائم رکھا ہے۔ تمام جزئیات کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے بیانیہ انداز میں قلمبند کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ساری رات عجیب عجیب خواب آتے رہے، کبھی گھڑیال زور زور سے بجتے اور کبھی کھوپڑیاں دھماد ھم میرے خیمے پر برستیں، ڈر کے مارے سردی کا احساس بھی جاتا رہا۔ صبح اٹھ کر باہر آیا تو خیمے کے ساتھ ساتھ کھوپڑیوں کی بجائے ڈھیروں جنگلی سیب بکھرے پڑے تھے جو رات تیز ہوا چلنے سے درخت کی شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے خیمے پر گرتے رہے اور مجھے خواہ مخواہ خوف زدہ کرتے رہے۔ میں نے جلدی سے اپنا خیمہ اکھاڑا اور لپیٹ کر سامان کے تھیلے میں رکھ لیا، کیمپنگ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد میں سیدھا اسٹیشن پر آیا اور سوئٹزر لینڈ کے دارالحکومت برن جانے والی پہلی گاڑی پر سوار ہو گیا۔"(۷)

مستنصر حسین تارڑ نے اس سفر نامے میں اپنے احساسات و جذبات کو لاشعور کے نہاں خانوں میں چھپانے اور اس سے صرف نظر کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ پورا عکس سامنے آجاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سفر نامہ نگار مشرقی تہذیب کا پروردہ ہے، ان کو جہاں بھی مغربی تہذیب راس نہیں آتی ہے اس کا ردعمل (Reaction) فوراً ظاہر کر دیتے ہیں۔ اپنے ایک دوست فالکر کے یہاں قیام کے دوران، غسل خانے میں فالکر کی بیوی کرن کی عریاں تصویر اور اس کے والد کی تصویر کو دیکھ کر، لکھا ہے کہ:

> "فالکر یہ تصاویر کس کی ہیں؟ میں نے کپڑے اتارتے ہوئے غسل خانے سے آواز لگائی۔
>
> "دروازے پر کیرن کی تصویر کینوس لگا ہے۔ اس طرح غسل کے دوران اسے آئینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔" اسٹوڈیو میں سے جواب آیا میرے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔
>
> "اور ٹائلٹ سیٹ کے اوپر اپنے والد صاحب ہیں۔ بوڑھے کو لٹکانے کے لیے یہی جگہ مناسب ہے" میں نے جلدی سے کپڑے دوبارہ پہننا شروع کر دیئے اور نہانے کا ارادہ ملتوی کر کے صرف ہاتھ منہ دھو کر ہی باہر آ گیا۔"(۸)

سفر نامے میں جہاں تقریباً پورے یورپ کی تاریخ، تہذیب و معاشرت کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا گیا ہے وہیں دوسری طرف انہوں نے ہوٹلوں، طعام کدوں اور باورچی خانوں، نیز ان کے رہن سہن کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔ جزئیات نگاری کے بیان میں ان کو کمال حاصل ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اسی شام ژیلیا نے مجھے اپنے فلیٹ میں کھانے پر مدعو کیا، فلیٹ کیا تھا پورا عجائب گھر تھا۔ دیواروں پر افریقہ کے قبائلی دیوتاؤں کے قد آدم مجسمے، مصری فراعنہ کی تشبیہیں، مراکو کا بنا ہوا چمڑے کا فرنیچر، سرخ ایرانی قالین، ڈریزڈن کے چینی ظروف، ڈماسک کے میز پوش، بُل فائٹنگ کی درجنوں تصاویر اور پھر بے شمار ساکن اور خاموش گھڑیاں ایک کونے میں ہاتھی دانت کی میز پر مختلف ملکوں کی موسیقی کے ریکارڈز رکھے تھے۔"(۹)

مستنصر حسین تارڑ نے مغربی تہذیب میں جو جنسی بے راہ روی ہے اس کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ جو یورپ کے تمام ملکوں میں عام ہے اور جنسی بے راہ روی میں یہ لوگ تمام دنیا کو مات کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو رجعت پسندی سے باہر نکالنے کے لیے ایک نیا طریقہ ڈھونڈ رکھا ہے۔ جنسی بے راہ روی کے تعلق سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ندی کے دوسرے کنارے پر لیٹے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے ہو؟ کیرن نے مسکراتے ہوئے پوچھا جانتے ہو انہوں نے نہانے کے لیے کیا پہن رکھا ہے۔"

"میں نے آنکھیں میچ کر جاننے کی کوشش کی، بہت دور ہیں صاف دکھائی نہیں دیتا"

"وہ سب پیدائشی لباس میں ہیں"

"یعنی وہ بالکل۔۔۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔"(۱۰)

اس ضمن میں ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"بالکل، اس نے کھسیانے ہو کر کہا" یہ سلسلہ چھ ماہ قبل شروع ہوا تھا جب ہماری حکومت نے اس قسم کی نیلی فلموں (Blue Film) پر عائد شدہ پابندیوں کو یکسر ختم کر دیا تھا اور اب ڈنمارک دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ایسی فلمیں بنانے اور ان کی نمائش کرنے کی کھلی اجازت ہے۔۔ یورپی تجارت کی یہ منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے۔۔ میں نے سر جھٹک کر کہا لیکن اگر نوخیز لڑکے اور لڑکیاں ایسی فلمیں دیکھ کر "سبق" حاصل کر لیں اور اس سبق کو عملی زندگی میں دہرانا چاہیں تو؟"

"کیا ہوا؟" موگنز نے میرا کندھا تھپکتے ہوئے جواب دیا۔"(۱۱)

ایک طرح سے یہ سفر نامہ جنسی مسائل کے بیان کا غماز بھی ہے۔ تارڑ نے یورپ کے اکثر ممالک کا مشاہدہ کیا اور ان کی خوبصورتی کی بڑی تعریف کی ہے۔ انہوں نے پیرس جیسے شہر کو پسند نہیں کیا ہے۔ یہاں کی

جمالیات نے سفر نامہ نگار کو متاثر نہیں کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو اس بات سے قطعی اختلاف ہے کہ پیرس بہت اچھا اور جاذب نظر شہر ہے۔ سفر نامہ نگار نے لندن، سوئٹزرلینڈ، ڈنمارک، جرمنی، ناروے، ہالینڈ وغیرہ کو ایک حقیقی سیاح کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن فرانس کی راجدھانی پیرس کے متعلق ان کا نظریہ مختلف ہے۔

"میں کبھی ان لاتعداد تاریخ دانوں، ادیبوں اور فنون لطیفہ کے شیدائیوں سے نہیں اتفاق کر سکا جن کی رائے میں دنیا میں اگر کوئی شہر ہے تو ہمیں است۔ مجھے ہمیشہ یہاں آکر گھٹن اور تنہائی کا احساس ہوا۔"(۱۲)

اس سفر نامے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ سفر نامہ نگار نے جن لوگوں سے سفر کے دوران ملاقاتیں کی ہیں۔ ان کا ذکر سفر نامے میں اس طرح کیا ہے جیسے ہم کسی افسانوی کردار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تارڑ ان شخصیات سے اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔ جیسے کسی افسانے کا راوی بعض کرداروں کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ سفر نامے کا ہر باب ہم کو کسی نہ کسی کردار سے متعارف کراتا ہے اور کردار کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے جیسے کہ مستنصر حسین تارڑ اس کو مدتوں سے جانتے ہوں اور اس طرح اس سے گھل مل جاتے ہیں کہ قاری محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب سفر نامہ نگار اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکے گا۔ لیکن وہ ایک حقیقی سیاح ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے دوسرے ملک کی طرف سفر جاری رکھتے ہیں۔ سفر نامے میں کچھ کردار جیسے سکھدیپ، مارگریٹا، فالکر، ربیکا، مائک ملر، اپاہج پاسکل وغیرہ ایسے کردار ہیں جنہوں نے قاری پر اپنے نقوش ثبت کیے ہیں۔

ان تمام کرداروں میں پاسکل وینس کی اپاہج لڑکی کے کردار کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس کردار کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری کی توجہ اختتام سفر نامہ تک مرکوز رہتی ہے اور مستنصر حسین تارڑ کا اس لڑکی سے ہمدردانہ رویہ قاری کو تعجب میں ڈال دیتا ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ محترمہ ہم سفر کے بجائے شریک حیات ہو جائیں گی لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے اور یہ ہی اس سفر نامے کی خوبی ہے اور قاری ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے پاسکل کے کردار کو ایک جدید افسانے کے روپ میں پیش کیا ہے۔

ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہوٹل پہنچ کر جب میں کار سے اترنے لگا تو پاسکل نے میرا بازو تھام لیا، زندگی میں پہلی بار آج مجھے اُس بوجھ کا احساس تک نہیں ہوا جس کے تلے میں ہر لمحے پستی رہی ہوں۔ آج میں بھی عام انسانوں کی طرح تھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کبھی بھی اپاہج نہ تھی، میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اس کی نیلی آنکھیں بھیگ رہی تھیں تم آخری روز یکمشت ہی شکریہ ادا کر

دینا مجھ سے اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔ آخری روز؟ اُس کا چہرہ اتر گیا، اس نے میرا بازو چھوڑ دیا، تم بہت تھک چکی ہو پاسکل؟ میں نے اس کے کندھے کو چھوتے ہوئے کہا گھر جا کر آرام کرو ہم کل پھر ملیں گے اور لوور جائیں گے۔"(۱۳)

مستنصر حسین تارڑ نے سفر نامے کو اپنے تخیل کی آمیزش سے ایک نئی جہت دی ہے۔ سفر نامے پر رومانویت غالب ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

"مارگریٹا نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دی جیسے پوچھ رہی ہو کیا خیال ہے؟ میں نے سر ہلا دیا، مجھ سے نہ ہو گا۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے۔ کہنے لگی "بزدل" میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر نیچے کر دیئے اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مارگریٹا کھلکھلا کر ہنس دی اور دونوں ہتھیلیاں کولہوں پر جما کر روایتی دھن پر ایک تیز اور شوخ رقص شروع کر دیا۔"(۱۴)

مندرجہ بالا اقتباس سے رومانوی اسلوب کا پتا چلتا ہے۔ سفر نامے کا اسلوب دل کش اور شگفتہ ہے۔ مکالمہ، منظر نگاری، جزئیات نگاری کو جس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے جو سادہ اور عام فہم ہیں بھاری بھر کم الفاظ استعمال کرنے سے گریز کیا ہے۔ ایک جاسوسی ناول کی طرح قاری پورے سفر نامے کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تارڑ نے اپنے اس بیانیہ افسانوی، فلسفیانہ تکنیک سے سفر نامے میں جان پیدا کر دی ہے۔

تارڑ "نکلے تیری تلاش میں" میں ایک ایسے سیاح نظر آتے ہیں جن کے پیش نظر صرف یورپ کا چکر لگانا نہیں تھا بلکہ وہ ایک بیدار نظر، ایک روشن دماغ اور حساس دل رکھتے ہیں اور وہ ان ممالک کی سطحی چمک دمک سے ہر گز متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ سفر نامہ نگار کا اپنا ایک مخصوص زاویہ نظر ہے۔ اسی نقطہ نظر کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں کے تاریخی، تہذیبی، سیاسی، تمدنی، ثقافتی، معاشرتی اور جغرافیائی کوائف کی تصویر کھینچ لی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید "اُردو ادب میں سفر نامہ" میں تارڑ کی سفر نامہ نگاری کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ شاید اردو کا واحد سفر نامہ نگار ہے جس نے سفر نامے سے پہلی محبت پیدا کی اور اب تک اس صنف میں "نکلے تیری تلاش میں"، "اندلس میں اجنبی"، "خانہ بدوش" اور "ہنزہ داستان" جیسے سفر نامے پیش کر چکا ہے۔ ان میں ہر سفر نامہ وسیع حلقے میں پڑھا گیا اور مستنصر کے فن کا ایک پائیدار نقش قائم کرنے میں معاون ثابت ہوا۔"(۱۵)

اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ جدید اردو سفر نامہ نگاری میں اس سفر نامے کی انفرادیت مسلم ہے۔ انہوں نے جدید اردو سفر نامے پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے جو آنے والے سفر نامہ نگاروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سعید احمد، آزادی کے بعد اردو سفر نامہ، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۹

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص۴۷

۳۔ ایضاً، ص۴۷

۴۔ سعید احمد، آزادی کے بعد اردو سفر نامہ، ص۲۳۱

۵۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، بار ششم ۱۹۸۷ء، ص۱۵۰۔۱۴۹

۶۔ ایضاً، ص۱۶۱

۷۔ ایضاً، ص۲۰۳

۸۔ ایضاً، ص۲۵۸

۹۔ ایضاً، ص۲۱۰

۱۰۔ ایضاً، ص۲۶۳

۱۱۔ ایضاً، ص۲۸۷

۱۲۔ ایضاً، ص۴۴۵

۱۳۔ ایضاً، ص۴۶۹

۱۴۔ ایضاً، ص۳۲۰

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص۲۵۷

گلستانِ سعدی منظوم پنجابی: تعارفی مطالعہ

Gulistan-e-Saadi in Punjabi Verse: An Introductory Study

غلام رسول* / ڈاکٹر سمیع اللہ**

Abstract:

This article presents an introductory and analytical study of Gulistan-e-Saadi, the celebrated ethical and literary Persian prose work of Saadi Shirazi, translated into Punjabi verse by Hakim Mian Fazl Elahi in 1938. Recognized as a masterpiece of Persian literature, Gulistan has been translated into more than forty languages worldwide, influencing literary traditions across regions, including the Indian subcontinent. Fazl Elahi's Punjabi rendition is a unique and poetic translation in the form of masnavi (rhymed couplets), preserving the moral and philosophical essence of the original while skillfully embedding it within the linguistic and cultural framework of Punjabi. His work also includes poetic translations of Quranic verses, Hadiths, and Arabic poetry, showcasing his command over Persian, Punjabi, Arabic, and Islamic thought. This article highlights the literary, cultural, and ethical dimensions of his translation and positions it as a significant contribution to Punjabi literature, especially within the context of Sufi and prophetic poetic traditions.

Key words: Saadi Shirazi, Punjabi poetic translation, Hakim Mian Fazl Elahi, Ethics and Morality, Sufi Literature, Masnavi, Persian Prose.

*وزٹنگ لیکچرر شعبہ فارسی گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

**اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

فارسی زبان ایران، تاجکستان اور برصغیر کے علاوہ دنیا کے بیشتر خطوں میں لکھی، پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ برصغیر میں تو اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی ایک عرصے تک اسے برصغیر کی سرکاری زبان کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ اسی طرح برصغیر سے کئی نامور فارسی شناس ابھرے ہیں۔ جن کی بدولت اس کرہ ارض سے ایسے شعراءو ادباء بھی پیدا ہوئے جنھوں نے بیک وقت ایک سے زائد زبانوں میں لکھا۔ مثلاً اردو، پنجابی اور فارسی، ہندی اور پشتو وغیرہ۔

مشرف الدین مصلح بن عبداللہ شیرازی معروف بہ سعدی شیرازی (۶۰۵ھ۔۶۹۱ھ) کی شہرہ آفاق کتاب گلستان سعدی(۶۵۵ھ) جو اپنے زمانہ تالیف سے لے کر آج تک دنیا بھر کے بیشتر سکول، کالجز اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کتاب کو گنجینہ اخلاق بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس کتاب کی غرض وغایت نفس کی تربیت، تہذیب وتادیب اور کردار کی اصلاح ہے۔

گلستان سعدی کو فارسی کی نثری کتب میں بلند مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب ایک دیباچہ اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ گلستان سعدی کا ہر باب اپنے اندر ایک خاص موضوع سموئے ہوئے ہے۔ یعنی گلستان سعدی کا ہر باب ایک خاص انداز میں اخلاقی تربیت کرتا ہے۔

تفصیل ابوابِ گلستان سعدی

باب اول	در سیرت پادشاہان	باب پنجم	در عشق وجوانی
باب دوم	در اخلاق درویشان	باب ششم	در ضعف وپیری
باب سوم	در فضلیت قناعت	باب ہفتم	در تاثیر تربیت
باب چہارم	در فوائد خاموشی	باب ہشتم	در آداب صحبت

بعض مورخین کے نزدیک گلستان سعدی وہ پہلی نثری کتاب ہے جس کی پیروی میں کئی کتب لکھی گئی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

بہارستان	از	عبدالرحمٰن جامی
شکرستان	از	میر قمرالدین منت دھلوی
پریشان	از	قآنی شیرازی
خارستان	از	مجد دین خوافی

اخلاقیات کے موتیوں سے مالا مال سعدی کی یہ کتاب اپنے خوانندگان کو دلی طور پر اس طرح متاثر کرتی ہے کہ دنیا کے بیشتر اہل علم و دانش نے اخلاقیات کے موتیوں کے اس خزانے کو اپنی اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ تاکہ وہ لوگ جو فارسی زبان کو نہیں سمجھ سکتے وہ ان گلستانِ اخلاق کے پھولوں کی خوشبو اپنی مادری زبان میں حاصل کر کے اپنے قلوب واذہان کو منور و تاباں کر سکیں۔

گلستان سعدی کے تراجم

گلستان سعدی کے قابل ذکر تراجم جو دنیا کی مختلف زبانوں میں کیے گئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

لاطینی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی، روسی، اطالوی، ترکی، چینی، ہسپانوی، پرتگالی، جاپانی، عربی وغیرہ شامل ہے۔

گلستان سعدی کے برصغیر میں تراجم

برصغیر کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں میں گلستانِ سعدی کا ترجمہ ہوا ہے جن میں اُردو، ہندی، بنگالی، پشتو، پنجابی، سندھی سرفہرست ہیں۔

مجموعی طور پر "گلستان سعدی" کا ترجمہ چالیس سے زائد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ دنیا کی چند ایسی کلاسیکی کتب میں شمار ہوتی ہے جن کا ترجمہ سب سے زیادہ کیا گیا ہے۔

حکیم میاں فضل الٰہی مترجم (گلستان سعدی منظوم پنجابی)

حکیم میاں فضل الٰہی، محمدی شریف ضلع چنیوٹ کے ایک ممتاز صوفی شاعر، عالمِ دین، طبیب حاذق اور مترجم تھے، جنہوں نے پنجابی ادب، طب، دینی تعلیمات اور سیرت نگاری کے میدان میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اُن کا تعلق قطب شاہی کھوکھر خاندان سے تھا اور اُن کا شجرہ نسب دسویں پشت میں میاں امام الدین سے جاملتا ہے[۱]، جنھوں نے محمدی شریف کو آباد کیا۔ حکیم فضل الٰہی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی اور حافظ غلام محمد[۲] سے قرآن حفظ کیا، فارسی سید اللہ جوایا[۳] اور عربی مولانا سلطان محمود[۴] سے پڑھی، پھر دہلی سے طب کی تعلیم حاصل کی اور واپس آکر ایک دواخانہ بہ نام "اسلامی دواخانہ" قائم کیا۔ اُن کے کلام میں عشقِ رسول ﷺ، تصوف، اصلاحِ معاشرہ، سیرتِ طیبہ اور اسلامی فکر کی روشنی نمایاں ہے۔ وہ خواجہ ضیاء الدین سیالوی کے مرید تھے اور اپنی روحانی نسبت کو شاعری میں عقیدت و محبت سے بیان کرتے ہیں۔ اُن کی تصانیف میں مجموعہ فراق، نور محمدی، گلشن رمضان المبارک، مفید الانام خواص الایام، سسی پنوں، گلستان سعدی منظوم پنجابی، فضل الستار (منظوم پنجابی ترجمہ

پند نامہ عطار)، سرِ الاطباء، گلزار محمدی منظوم پنجابی جیسی نایاب کتب شامل ہیں، جن میں سیرت نگاری، نعتیہ ادب، فارسی منظومات کے منظوم ترجمے اور دینی اخلاقیات کی خوبصورت جھلک ملتی ہے۔ پنجابی شاعری میں سیرت نگاری کو فروغ دینے والے نمایاں شعراء میں اُن کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔ اُن کے علمی، دینی اور ادبی کارنامے آج بھی پنجابی تہذیب، اسلامی علوم اور صوفیانہ ادب کی روشن روایت کا معتبر حوالہ ہیں۔ وہ ۷ مارچ ۱۹۶۴ء کو وفات پا گئے(۵)، مگر اُن کا فکری و روحانی فیض آج بھی زندہ و مؤثر ہے۔

گلستان سعدی منظوم پنجابی

دیگر مترجمین کی طرح حکیم میاں فضل الٰہی نے بھی ضروری سمجھا کہ اخلاقیات کے اس خزانے کا پنجابی زبان میں ترجمہ ضروت وقت ہے کہ پنجابی زبان و ادب سے وابستہ لوگ جو فارسی زبان سے نابلد ہیں انھیں ان کی مادری زبان میں ایک تحفہ کی صورت میں پیش کیا جائے۔ مترم نے گلستان سعدی کا یہ منظوم پنجابی ترجمہ ۱۳۵۷ھ بہ مطابق ۱۹۳۸ء کو مکمل کیا(۶)۔ جب یہ طے ہو گیا کہ اس کا ترجمہ کرنا ہے تو اس سے اگلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ ترجمہ منثور ہو یا منظوم۔ چوں کہ فضل الٰہی ایک بلند پایہ پنجابی شاعر تھے تو انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ترجمہ منظوم کیا جائے۔ اس ترجمہ کی اہمیت و افادیت کے بارے میں تنقید و دعا و تاریخ طبع کے عنوان کے نیچے لکھتے ہیں۔

ایہ پر وچ پنجابی بولی کوئی ترجمہ انہاندا بہتی بھال کیتی پر مینوں کدھرے نظر نہ آندا
اس دی جیڈ پنجابیاں تائیں سخت ضرور آہی اس تھیں ایڈ پنجابی شاعراں ورتی بے پرواہی(۷)

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ گلستان سعدی کا واحد منظوم پنجابی ترجمہ حکیم فضل الٰہی کا ہی ہے۔ البتہ گلستان سعدی کے پنجابی میں نثری تراجم موجود ہیں۔

جب ہم گلستان سعدی کا منظوم پنجابی ترجمہ پڑھتے ہیں تو حکیم فضل الٰہی (۱۸۹۹ء / ۱۹۶۴ء) میں ایک اچھے مترجم کے تمام اوصاف واضح نظر آتے ہیں۔ پنجابی کا یہ منظوم ترجمہ ہند اسلامی ثقافت کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ حکیم فضل الٰہی شعوری یا لاشعوری سطح پر پنجابی ثقافت کو نبھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ عمل فارسی متن کے خیال کو نقصان پہنچائے بغیر سرانجام دیا گیا ہے۔ اور اس ترجمے کی یہی خوبصورتی کہ ترجمہ متن کو پیچھے نہیں چھوڑتا۔ بہ طور مثال دیکھیے:

بچہ کار آیدت ز گل طبقی؟ از گلستان من ببر ورقی
ایہ گل دستے تیرے تائیں کس کم آون بھائی لئے جا باغ میرے تھیں پتے جے لوڑیں بھلیائی
گل ہمین پنج روز و شش باشد وین گلستان ہمیشہ خوش باشد

پنج چھ روز ایہ رہسیں رونق خوش خوشبو گلاں دی میرا باغ ہمیشہ ہریا کدیں نہ رونق جاندی(۸)

گلستان سعدی منظوم پنجابی، گلستان سعدی کی طرح ایک دیباچہ اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے یعنی فضل الٰہی نے ترجمے میں ترتیب کو بالکل اسی طرح سامنے رکھا ہے جس طرح شیخ سعدی کی ترتیبِ گلستان ہے۔ لیکن فضل الٰہی نے گلستان سعدی منظوم پنجابی کے آخر پر (تنقید و دعا و تاریخ طبع) کے عنوان سے ایک منظوم باب شامل کیا ہے۔ جس میں گلستان سعدی، اس کی اہمیت و افادیت، گلستان سعدی کا پنجابی ترجمہ کرنے کی وجہ اور اس کتاب کی تاریخ طبع شامل کی ہے۔ یہ کتاب ۳۲۲صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلے فارسی متن لکھا ہے اور پھر اس کے نیچے فارسی متن کا منظوم پنجابی ترجمہ درج ہے۔ مثال کے طور پر ہم دیباچہ کی پہلی حکایت دیکھتے ہیں۔

منت خدای راعزوجل کہ طاعتش موجب قربت است و بہ شکر اندرش مزید نعمت ہر نفسی کہ فرومیرود ممد حیات است وچون نبر می آید مفرح ذات پس در ہر نفسی دو نعمت موجود ست و بر ہر نعمتی شکری واجب۔

بخشش تے احسان تمامی خاص خدا اکبر دے غالب عالی عظمت والا اندر کل دہر دے
درجہ قربت حضوری حاصل اس دی بندگی پاروں اس دا شکر کمایاں ملدی نعمت باجھ شماراں
جو ساہ اندر جاوے بھائی ہے اوہ عمر ودھاندا تن من نوں کیا فرحت بخشے جس دم باہر آندا
ہرہر دم اندر دو نعمت رکھی ذات خدائی ہرہر نعمت دا شکریہ واجب میرے بھائی(۹)

صنف منظوم ترجمہ (گلستان سعدی منظوم پنجابی)

حکیم فضل الٰہی نہ صرف پنجابی زبان کے ایک بلند پایہ شاعر تھے بلکہ وہ مختلف اصنافِ سخن پر گہری دسترس بھی رکھتے تھے۔ ان کی فکری وسعت اور فنّی مہارت کا اندازہ اس وقت بخوبی ہوتا ہے جب ہم گلستانِ سعدی کے نثری حصے کا اُن کے قلم سے کیا گیا منظوم پنجابی ترجمہ ملاحظہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اس عظیم فارسی نثر پارے کو مثنوی کے قالب میں ڈھال کر نہ صرف اس کے معنوی حسن کو برقرار رکھا بلکہ پنجابی شاعری میں ایک نیا باب بھی رقم کیا۔ ان کا یہ ترجمہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ وہ نثر کو نظم میں منتقل کرنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

در خبر است از سرور کائنات مفخر موجودات ورحمت عالیمان وصفوت آدمیان و تتمہ دور زمان محمد ﷺ۔

سرور عالم فخر جگت دے رحمت جمل جہانے برگزیدہ نسل آدم تھیں خاتم دور زمانے(۱۰)

گلستان سعدی میں شیخ سعدی نے بیشتر مقامات پر آیات کریمہ، احادیث مبارکہ، عربی اشعار، اقوال و کلمات کا استعمال کیا ہے۔ مترجم نے اس عربی حصہ کا بھی منظوم پنجابی ترجمہ کیا ہے۔

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَّ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ۔

اے اولاد داود نبی دی شکر کرو ہر حالے ہین تھوڑے بندے میرے شکر کماون والے(۱۱)

اس آیت کریمہ کے منظوم پنجابی ترجمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فضل الٰہی محض اُردو، پنجابی، اور فارسی کے ہی ماہر نہیں تھے بلکہ انھیں عربی زبان وادب سے بھی شغف تھا۔

شیخ سعدی کے مشہور نعتیہ اشعار جو گلستان سعدی کے دیباچہ میں شامل ہیں کا ترجمہ دیکھتے ہیں۔

بَلَغَ الۡعُلٰی بِکَمَالِہٖ بیت کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ

پہنتا نال کمال اپنے دے درجے عالی تائیں حسن جمالوں دور اندھیرے کیتے سرور سائیں

حَسُنَتۡ جَمِیۡعُ خِصَالِہٖ صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ

سارے سوہنے کم نبی دے میں قربانی جائیں سید پاک تے آل ساری پر پڑھو درود دورائیں(۱۲)

گلستان سعدی کا آغاز دیباچہ سے ہوتا ہے جس میں شیخ سعدی نے کتاب کا سبب تالیف اور سال تصنیف کو تحریر کیا ہے۔ اور اسی میں سعد بن زنگی کو گلستان معنون کرتے نظر آتے ہیں۔ اب گلستان سعدی کے دیباچے کا ابتدائیہ فضل الٰہی کے منظوم پنجابی ترجمہ کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

ذکر محامد بادشاہ اسلام اتابک ابو بکر بن سعد بن غفر اللہ

ذکر جمیل سعدی کہ در افواہ عوام افتادہ است وصیت ستحتش کہ در بسیط زمین رفتہ وقصب الجیب حدیثش کہ ہم چو شکر می خورند ورقعہ منشآتش کہ ہم چون کاغذ زر می برند، بر کمال فضل وبلاغت او حمل نتوان کرد، بلکہ خداوند جہان وقطب دائرہ زمان و قائم مقام سلیمان وناصر اہل ایمان شہنشاہ معظم اتابک اعظم مظفر الدنیاوالدین ابو بکر بن سعد زنگی ظِلُّ اللّٰہِ تَعَالٰی فِیۡ اَرۡضِہٖ رَبِّ ارۡضَ عَنۡہُ وَاَرۡضِہٖ بعین عنایت نظر کردہ است و تحسین بلیغ فرمودہ واردات صادق نمودہ لاجرم کافہ انام، خاصہ وعوام بہ محبت او گرائید اندوَالنَّاسُ عَلٰی دِیۡنِ مُلُوۡکِھِمۡ.

ذکر کمال سعدی دا آیا عاماں دے منہ بھائی دنیا وچ آواز سخن دا پہنچ گیا ہر جائی

پونڈے عجب کلام سعدی دے شکر وانگوں کھاون وانگ سنہری کاغذ ورقے کاپیاں دے لے جاون

ایڈ کمال تے ایڈ بزرگی میرے وچ نہ کوئی ایہ سب عین عنایت شاہ دی اس بندے تے ہوئی

بے شک ہے اوہ صاحب جگ دا کلی دور زمن دی نائب شاہ سلیمان نبی دا جگ وچ جگہ امن دی

اہل ایماناں دا امدادی شاہ اتابک عالی فضلوں ہے فتح مندی حاصل دین تے دنیا والی

بو بکر بن سعد تے سعد ہے فرزند زنگی دا دنیا دے وچ ظل الٰہی رہے ہمیشہ جیندا
اے رب راضی ہو اس اوپر رکھ راضی اس تائیں کوئی تکلیف نہ ویکھے شالا اندر دوہیں سرائیں
کیتیاں خاص عنایت نظراں صدق ارادت پاروں وصف اتے تحسین زیادہ کردا شوق پیاروں
اس گل پاروں خاص عوامی لوک تمام دہر دے میری صدق محبت والا ہیں سداں دم بھر دے
اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ سچ مقولے آندے لوگ رعائے دین قبولن اپنے بادشاہاں دے(۱۳)

ان اشعار میں سب سے پہلے شیخ سعدیؒ کے کلام کی خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ان کا کلام ہر طرف مشہور و مقبول ہے، اور لوگ ان کے اشعار کو شوق سے پڑھتے، لکھتے اور سجاتے ہیں، جیسے میٹھے شکر کی مانند ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے عاجزانہ لہجے میں کہتا ہے کہ یہ سب کمال میرے اپنے اندر نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔ پھر اشعار میں ابو بکر سعد بن زنگی کے اوصاف و خوبیوں کا ذکر آتا ہے۔ انھیں نائبِ سلیمان نبی کہا گیا ہے، یعنی انصاف پسند، امن قائم کرنے والا، دین و دنیا میں کامیاب، اور اہلِ ایمان کی مدد کرنے والا حکمران۔ شاعر انھیں ظلِ الٰہی (اللہ کا سایہ) قرار دیتا ہے اور ان کی درازیِ عمر کی دعا کرتا ہے کہ اللہ ان سے راضی رہے اور انھیں ہر دکھ و تکلیف سے محفوظ رکھے۔

آخر میں شاعر کہتا ہے کہ یہ ساری تعریف و محبت اس کی سچی ارادت اور محبت کی بنیاد پر ہے، اور یہ سب عوام و خاص دونوں کی طرف سے اس بادشاہ کے حق میں ہے۔ شاعر "والناس علی دین ملوکھم" (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین و طرز پر ہوتے ہیں) جیسے عربی مقولے سے یہ بات بیان کرتا ہے کہ اچھے بادشاہ ہی اپنی رعایا کو راہِ حق پر رکھتے ہیں۔

سبب تالیف کتاب

اس عنوان کے نیچے شیخ سعدی نے گلستان سعدی کی تصنیف کے سبب کو بیان کیا ہے۔ جس میں نثر کے ساتھ اشعار بھی شامل ہیں۔

یک شب تامل ایام گذشتہ می کردم و بر عمر تلف کردہ تاسف می خوردم و سنگ سراچہ دل را بالماس آب دیدہ می سفتم و این بیت ہا مناسب حال خود می گفتم۔

ہک راتیں میں وقت گئے دا ہیساں فکر کریندا زایاں عمر گنوائی اوپر تلیاں بیٹھ ملیندا
لے کر ہیرا ہنجوں والا دل پتھر دے تائیں روندا اتے پروندا جاندا دل وچ سوز ورائیں
حال مناسب نال محبت ایہ اشعار گرامی ول ول دردوں کہندا ہیساں سنیو ذکر تمامی(۱۴)

آخر میں جن اشعار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے چند اشعار منظوم پنجابی ترجمہ کے ساتھ درج ذیل ہیں:

ہر دم از عمر می رود نفسی چون نگہ می کنم نماند بسی
پل پل عمر پیاری والا عرصہ گذریا جاندا جد کر غور ڈٹھا میں اس نوں باقی کجھ نہ رہندا
ای کہ پنجاہ رفت و در خوابی مگر این پنج روز دریابی
عمر پنجاہاں تھیں لنگھ چکی ہیں توں خواب وچالے باقی ایہ پنج روز سنواریں کر کے ہوش سمھالے
خجل آن کس کہ رفت وکار نساخت کوس رحلت زدندو بار نساخت
جو کوئی کم سنوار نہ گیا شرم پسیں اوہ بھارا اجے نہ بھار سفر دے بدھے وج گیا کوچ نگارا(۱۵)

باب اول در سیرت پادشاہان

یہ باب بادشاہوں کی سیرت و کردار کے متعلق ہے۔ اس باب میں بادشاہوں کے عدل و انصاف اور ان کی محکوم عوام کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب کی پہلی اور مشہور و معروف حکایت بمعہ منظوم پنجابی ترجمہ دیکھتے ہیں۔

حکایت: پادشاہی را شنیدم کہ بکشتن اسیری اشارت کرد بیچارہ بیچارہ دران حالت نومیدی ملک را دشنام دادن گرفت وسقط گفتن، کہ گفتہ اند: ہر کہ دست از جان بشوید ہر چہ در دل دارد بگوید:

سنیا میں سی ہک شاہ عادل اندر کسے زمانے ہک قیدی نوں حکم قتل دا دتا یار سیانے
اس مایوسی دے جھٹ اندر اوہ مسکین بیچارہ اپنی بولی دے وچ شاہ نوں گالیں دے وے یارا
کیوں جو کوئی جان اپنی تھیں دھووے ہتھ نمانا آکھے جو دل آوے اس دے عاجز درد رنجانا(۱۶)

شیخ سعدی کے وہ مشہور اشعار جن میں وہ اچھا کام کرنے کی تلقین، برائی سے بچنے اور بعد از مرگ انسان کیسے زندہ رہتا ہے کے بارے میں بتاتے ہیں وہ اشعار بھی اسی باب کا حصہ ہیں۔ ان کا منظوم پنجابی ترجمہ دیکھتے ہیں:

بس نامور بزیر زمین دفن کردہ اند کز ہستیش برویزمین درنشان نماند
بہوں مشہور زمیں دے اندر ہو گئے دفن نمانے جگ وچ نام نشان نہ رہیا ایسا رب نوں بھانا(۱۷)
و آن پیر لاشہ راکہ سپرد ند زیر خاک خاکش چنان بخورد کز واستخوان نماند
جس مسکین بڈھے نوں لوکاں سوپیا خاک وچالے مٹی انج کھادا ہڈیاں نوں نہ رہیا مول نشانا
زندہ است نام فرخ نو شیروان بخیر گرچہ بسی گذشت کہ نوشیروان نماند
نام مبارک نوشیرواں دا عدلوں زندہ بھائی بھاویں بہت زمانے گذرے دنیا چھوڑ سدھانا

خیری کن ای فلان و غنیمت شمار عمر زان پیشتر کہ بانگ بر آید فلان نماند
سمجھ غنیمت عمر تے کر لے نیکی اس تھیں پہلے دنیا دے وچ ملے ڈھنڈورا مر گیا شخص فلانا(۱۸)

شیخ سعدی نے گلستان سعدی میں ایک قطعہ لکھا ہے جو اس قدر مقبول ہے کہ یہ قطعہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی دیوار کی زینت بنایا گیا ہے۔ فضل الٰہی نے اس قطعے کو کس انداز میں منظوم پنجابی میں کیا ہے۔ ملاحضہ ہو:

بنی آدم اعضای یک دیگراند قطعہ کہ در آفرینش زیک گوھرند
نسل آدم دی ہک دوجے دے بازواں وانگوں بھائی کیوں جو اصل پیدائش اندر ہکو اصل ایہائی
چو عضوی بدرد آورد روزگار دگر عضوھا را نماند قرار
جس دم ہک بازوں دے تائیں درد مصیبت آوے باقی کل اعضاواں تائیں صبر قرار سدھاوے
توکز محنت دیگران بی غمی نشاید کہ نامت نھند آدمی
توں جے خلقت دی تکلیفوں ہیں بے غم سدائیں نام تیرا پھر رکھن آدم مول مناسب نائیں(۱۹)

باب دوم در اخلاق درویشان

گلستان سعدی کا یہ باب مجموعی طور پر اخلاقیات کے گرد گھومتا ہے۔ خاص طور پر اس باب میں درویشوں، صوفیوں اور اللہ کے نیک بندوں اور ان کے اخلاق کے متعلق ہے۔ اس باب سے چند ایک حکایات و قطعات کا منظوم پنجابی ترجمہ دیکھئے:

حکایت: درویشی را دیدم کہ، سر بر آستان کعبہ می مالید و ہمی نالید و می گفت: یاغفور یار حیم، تو دانی کہ از ظلوم وجہول چہ آید؟

ہک درویش حضوری تائیں ڈٹھا میں ہک واری سر چوکاٹھ کعبے پر دھریا روندا کرکر زاری
آکھے اے غفار قدیمی رحمت کرنے والے جاہل ظالم تھیں کی بن دا معلم تینوں حالے(۲۰)

مثنوی کے اشعار کا منظوم ترجمہ دیکھیے ہیں جن میں شیخ سعدی نے حضرت یعقوب و حضرت یوسف کا ذکر ہے۔

یکی پرسید از آن گم کردہ فرزند مثنوی کہ ای روشن گہر پیر خرد مند
بچھیا کسے یعقوب نبیؑ تھیں ہک دن میرے بھائی روشن اصل تے پیر جگت دے عاقل اہل دانائی
زمصرش بوی پیراہن شنیدی چرا در چاہ کنعانش ندیدی؟
مصروں خاص قمیض یوسفؑ دی سونگھ لئی خوش بوئی کیوں اس کہوہ کنعان وچالے پت دی خبر نہ ہوئی
بگفت احوالِ مابرقِ جہان است دم پیدو دیگر دم نہان است

کہیا پیغمبرؐ حال اساڈے بجلی دے لسکارے ہک دم ظاہر ہک دم خفیہ سن توں یار پیارے
گہی برطارمِ اعلیٰ نشینم گہی بر پشت پای خود نہ بینیم
ہک ویلے ایہ نظر اساڈی گزر جاوے آسمانوں ہک ویلے کنڈ پیر اپنے دی دِسّے نہیں اسانوں
اگر درویش درحالی بماندی سرِ دست ازدو عالم برفشاندی
جے درویش گرامی رہندا ہکسے حال وچالے ہوندے دور ٹکانے اس دے دوہاں جہاناں والے(۲۱)

باب سوم در فضیلت قناعت

اس باب میں قناعت پسندی کی فضیلت کو بہ طریق احسن بیان کیا گیا ہے۔ شیخ سعدی نے اس باب میں حریص سے دور رہنے اور جو کچھ مالک کی طرف سے عطا ہوا ہے اس پر اکتفا کرنے کا درس دیا ہے۔ نمونے کے طور ایک بیت وحکایت کو فضل الٰہی کے منظوم ترجمہ کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

معدہ چُو پرگشت و شکم درد خاست شعر سود ندارد ہمہ اسباب راست
جس ویلے پر معدہ ہووے ڈھڈھ وچ درد اٹھیندے دنیا دے سامان تمامی کچھ بھی نفع نہ دیندے(۲۲)

دنیا میں سخاوت کی بدولت مشہور حاتم طائی کے متعلق حکایت بھی اسی باب کا حصہ ہے۔

حکایت: حاتم طائی را گفتند: از خود بزرگ ہمت تر در جہان دیدہ ای یا شنیدہ ای؟ گفت: بلی روزی چہل شتر قربان کردہ بودم، امرای عرب راپس بہ گوشہ صحرائی بہ حاجتی برون رفتہ بودم۔ خار کنی رادیدم پستہ خار فراہم آوردہ، گفتمش بہ مہمانی حاتم چرا نہ روی؟ کہ مخلقی بر سماط او گرد آمدہ اند۔ گفت:

ہک دن حاتم طائی کولوں پچھیا رل مل یاراں بخشش اتے سخاوت والیاں دس سانوں اخباراں
اپنے نالوں عالی ہمت کوئی اس جگ وچالے ڈٹھا ہے یا سنیا تدھ نے کھول تمام حوالے
کہن لگا ہاں ہک دن میں نے ذبح کیتے اوٹھ چالی خاص امیراں عرباں کارن سن توں یار سوالی
میں پھر جنگل پھرنے کارن جنگل طرف سدھایا گوشے بار اندر ہک ماچھی مینوں نظریں آیا
جوڑی کھلا مشقت کرکے لدا ہک ڈھنگر اندا آکھیا میں توں دعوت حاتم دے ول کیوں نہیوں جاندا؟
دستر خوان حاتم دے اج دن خلق اکٹھی آئی ایہ گل سن کر اس مردانے ایہ گل آکھ سنائی
ہر کہ نان از عمل خویش خورد فرد منت حاتم طائی نبرد
جو کوئی شخص ہمیشہ روٹی آپ کماکر کھاندا لگدے وس احسان حاتم دا نہیں اوہ مرد اٹھاندا(۲۳)

باب چہارم در فواید خانوشی

گلستان سعدی کا یہ باب خاموشی کے فواید پر دلالت کرتا ہے۔ اس باب میں شیخ سعدی نے خاموشی کے فواید اور فضول گفتگو کے نقصانات سے آگاہ کیا ہے۔ اس باب کی پہلی حکایت اور اس کے ذیل میں شامل اشعار کا منظوم پنجابی ترجمہ فضل الٰہی کی زبان میں کیا گیا ہے۔

حکایت: یکی رااز دوستان گفتم امتناع سخن گفتنم: بہ علّتِ آن اختیار آمدہ است در غالب اوقات در سخن نیک وبد اتفاق افتد ودیدہ دشمنان جز بربدی نمی آید۔ گفت: دشمن آن بہ کہ نیکی نہ بیند۔

ہکی شخص پیاریاں وچوں آکھیا میرے تائیں — کیوں تدھ روک دتی گل کرنی مینوں حال سُنائیں
آکھیا میں نے اس سببوں چپ پسند لیاندی — بُری بھلی گل اکثر ویلے منہ تھیں نکل جاندی
دشمن دی اکھ گل بری تے بیٹھی تاڑ لگائی — کدیں پسند نہ آوے بھائی دشمن نوں بھلیائی
بول جواب کہیا سعدی نوں یار حقانی پکے — دشمن بھی اوہ چنگا جہڑا نیکی طرف نہ تکے

وَاَخُوْا العداوۃ لَایَمُرُّ بِصَالِحٍ شعر اِلَّا و یَلْمِزُہٗ بِکَذَّابٍ اَشِرٍ

دشمن کدیں نہ گزرے ایویں نیک نیتی دے پاروں — جے گزرے تاں تہمت لاوے باجھ حساب شماروں
ہنر بہ چشم عداوت بزرگتر عیبی است شعر گل است سعدی و در چشم دشمنان خار است
فن ہنر سب دشمن دے گھر عیباں وچ گنیوے — ہے پُھل سعدی دشمن تائیں کنڈیاں وانگ دسیوے(۲۴)

باب پنجم در عشق وجوانی

گلستان سعدی کا یہ باب جوانی و عشق کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب سے ایک حکایت و بیت کا ترجمہ دیکھئے:

حکایت: در عنفوان جوانی، چنان کہ افتد و دانی، باشاہدی سری و سرّی داشتم، بہ حکم آن کہ حلقی داشت طَیبُ الادا و خلقی کَالْبَدَرِ فِیْ الدُّجیٰ۔

سعدی کہے جیویں جگ اندر اکثر واقعہ ہوندے — نویں جوانی اندر گجہڑے عشق قضئیے پوندے
مینوں بھی ہک دلبر دے سنگ عشق محبت آہی — راز نیازاں دے وچ پھسیا رب دی بے پرواہی
خوش الحان ہے سی اوہ سوہنا سوہینیاں طرز ادائیں — سوہنی صورت وانگ بدر دے چمکن نور شعائیں
آن کہ نبات عارضش آب حیات می خورد بیت درشکرش نگہ کند، ہر کہ نبات می خورد

سبزہ گل رخسار ماہی دا کھاوے آب حیاتی مصری کھاندا ہوٹھ سجن ول لُک لُک پاوے جھاتی(۲۵)

باب ششم در ضعف و پیری

اس باب میں کمزوری اور بڑھاپے کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر اس باب سے حکایت و اشعار کا منظوم ترجمہ دیکھتے ہیں:

حکایت: پیر مردی را گفتند: چرا زن نکنی گفت: با پیر زنانم عیشی نباشد، گفتند جوانی بخواہ، چو مکنت داری۔ گفت: مرا کہ پیرم با پیر زنان الفت نیست، پس او را کہ جوان باشد با من کہ پیرم چہ دوستی صورت بندد؟

کرن روایت ہک بڈھے نوں لوکاں کہیا زبانی دس شتابی کیوں توں بھائی کردا نہیں زنانی
بڈھے آکھیا بڈھیاں مینوں مول پسند نہ آون نویاں ناریں میں بڈھڑے نوں کیویں پسند لیاون(۲۶)

اس حکایت کے ذیل میں شامل قطعہ دیکھتے ہیں:

پیر ہفطاثلہ جونی می کند قطعہ عشغ مقری فحنی بونی چش روشت
ستر ورہیاں دا جو بڈھا کیوں کر کرے جوانی انہاں مادر زاد خواباں وچ ویکھے چشم نورانی
زور باید نہ زر، کہ بانورا گذ ری دوست تر کہ دہ من گوشت
زور چاہیے نہیں حاجت زر دی سوچیں عقل کمالوں گاجر ہک چنگی زن کارن دہ من گوشت نالوں(۲۷)

باب ہفتم در تاثیر تربیت

گلستان سعدی کا ساتواں باب تربیت کی تاثیر کے متعلق ہے۔ اس باب میں شیخ سعدی نے تربیت کی اہمیت و افادیت کو بیان کیا ہے:

حکایت: یکی راشنیدم، از پیران مربّی، کہ مریدی را ہمی گفت: ای پسر، چنان کہ تعلق خاطرِ آدمی زاد بروزی است اگر بروزی رسان بودی بہ مقام از ملائکہ در گزشتی۔

سنیا میں ہک پیر مربی اپنے طالب تائیں ہک دن ایہ فرماندا ہیسی سن میں ذکر سنائیں
جوں کر دلی تعلق ڈاڈھا شوق محبت بھاری روزی دے سنگ اس بشر دی ہوگ ہمیشہ یاری
جے کر اتنی رازق دے سنگ عشق محبت لاندا عالی شان تے درجہ اس دا ملکاں تھیں لنگ جاندا(۲۸)

اسی باب میں شیخ سعدی اپنے استاد کی نرمی، حلم اور بردباری کو سراہتے ہوئے ایک ایسا شعر بیان کرتے ہیں جس میں استاد کی مزاجی خوبیوں کا گہرا عکس جھلکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک اچھا استاد وہی ہوتا ہے جو علم کے ساتھ

ساتھ اخلاق کا پیکر ہو، اور نرمی سے طالبعلم کے دل میں علم کی روشنی پیدا کرے۔ سعدیؒ کے نزدیک سخت مزاجی علم کی ترسیل میں رکاوٹ بنتی ہے، جب کہ نرم مزاجی، محبت اور شفقت سیکھنے کے عمل کو مؤثر بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے استاد کی تعریف کرتے ہوئے نرمی کو تربیت کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔

اُستاد و معلم چو بود بی آزار بیت خرسک بازند کودکان در بازار

جو استاد شاگرداں تائیں دے وے جھڑک نہ ماراں قسم قسم دیاں کھیڈاں کھیڈن لڑکے وچ بازاراں(۲۹)

باب ہشتم در آداب صحبت

گلستان سعدی کا آخری باب آداب صحبت سے متعلق ہے۔ اس باب میں مختلف امور ہائے زندگی کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ اس باب کے ابتدایہ حصے کو دیکھتے ہیں۔

مال از بہر آسائش عمر است نہ عمر از بہر گرد کردن مال، عاقلی را پرسیدند نیک بخت کیست و بد بختی چیست؟ گفت: نیک بخت آن کہ خورد و کشت و بد بخت آن کہ مرد و ہشت۔

زندگی دی آسائش کارن دولت مال تمامی دولت دنیا جوڑن کارن نہیں ایہ عمر گرامی(۳۰)

دانش مند کسے تھیں پچھیا پچھن والیاں بھائی نیک بخت تے بدبخت دا کیہڑا فرق ایہائی

واہ کیا عجیب جواب انہاں نوں دانشمند سنایا ظاہر باہر فرق دوہاندا واضح کر سمجھایا

کھاوے تے گڈ جاوے جہڑا اوہ ہے بختاں والاں جوڑ خزانے چھوڑ سدھاوے اوہ بدبخت مہ کالا(۳۱)

اس باب میں شیخ سعدی اخلاص، محبت اور بھائی چارے کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی، ہمدردی اور مروّت سے پیش آنا چاہیے۔ دلوں کی پاکیزگی اور نیت کا اخلاص ہی معاشرتی ہم آہنگی کی بنیاد ہے۔ سعدی کے نزدیک سچا تعلق وہی ہے جس میں ذاتی مفاد نہ ہو بلکہ دوسروں کی بھلائی مقصود ہو۔ اُن کی تعلیمات آج بھی انسان کو ایثار اور باہمی تعاون کی راہ دکھاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

حکمت دہ آدمی بر سفرہ بخورند و دو سگ بر مرداری باہم بسر نبرند۔ حریص باجہانی گرسنہ است و قانع بنانی سیر حکما گفتہ اند: توانگری بہ قناعت بہ از توانگری بضباعت۔

دستر خوان ہکی دے اتے دس بشر رل کھاندے دو سگ ہک دھر ہنگے اتے نا اتفاق لیاندے

سارا جگ ملے حرصی نوں پھر بھی رجدا ناہیں اہل قناعت ہک روٹی تھیں رجیا رہے سداہیں

بھکھا مرد قناعت والا کہن حکیم سیانے افضل جان توانگراں نالوں جنہاں بھرے خزانے(۳۲)

گلستان سعدی کا وہ شعر جو ضرب المثل بنا وہ بھی اسی باب کا حصہ ہے۔

اگر شب ہا ہمہ قدر بودی شعر شب قدر بی قدر بودی
جے کر شب قدر سب راتیں ہوندیاں یار پیارے شب قدر دا قدر نہ رہندا ندر عالم سارے(۳۳)

آخرین باب (تنقید و دعا و تاریخ طبع)

گلستان سعدی منظوم پنجابی کے آخر پر فضل الٰہی نے تنقید و دعا و تاریخ طبع کے عنوان سے ایک باب شامل کیا ہے۔ اس باب کے ابتدای حصہ میں گلستان سعدی کی اہمیت و افادیت، شیخ سعدی کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔

ایہ پر شیخ سعدی دے وانگوں کسے نہ شہرت پائی پند نصیحت اندر سب تھیں سبقت لے گیا بھائی(۳۴)

ان سے اگلے اشعار میں وہ بیان کرتے ہیں ہیں کہ میں نے بہت کھوج لگائی ہے لیکن مجھے پنجابی زبان میں گلستان سعدی کا منظوم ترجمہ نہیں ملا۔ اور انھیں اشعار میں ایک جگہ وہ نالاں بھی نظر آتے ہیں اور پنجابی شعراء سے شکوہ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گلستان سعدی کی جس قدر پنجابی زبان میں ضرورت تھی اسی طور پنجابی شعراء نے بے پروائی سے کام لیا ہے۔

اس سے آگے لکھتے ہیں کہ میں نے فرض سمجھ کر یہ کام (گلستان سعدی کا منظوم پنجابی ترجمہ) کیا ہے۔ یہ پنجابی زبان والوں کے لیے ایک پنہاں خزانہ تھا جسے میں نے پنجابی دوستوں کے لیے ان کی مادری زبان میں ترجمہ کر کے انھیں تحفتاً پیش کیا ہے۔ تا کہ وہ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

منصب فرض سمجھ کر اس نوں حافظ پورا کریا خفیہ گنج لیاندا ظاہر پیش یاراں دے دھریا
پڑھ پڑھ لطف اٹھاسن، پاسن فیض پنجابی بھائی میرے کارن طلب کریسن نور ایمان صفائی(۳۵)

گلستانِ سعدی کا یہ منظوم پنجابی ترجمہ نہ صرف لسانی اظہار کا حسین نمونہ ہے بلکہ یہ برصغیر کی تہذیبی یکجہتی اور فکری ہم آہنگی کا ایک زندہ حوالہ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس ترجمے کے ذریعے فارسی کی کلاسیکی حکمت اور اخلاقی مضامین پنجابی زبان کے قاری تک اپنی اصل معنویت کے ساتھ پہنچتے ہیں۔ یہ کام نہ صرف ادبی ورثے کے تحفظ میں مددگار ہے بلکہ زبان و بیان کی جمالیات کو بھی تقویت دیتا ہے۔ پنجابی قاری کے لیے یہ ترجمہ ایک ایسا دروازہ کھولتا ہے جس سے وہ اپنی مادری زبان میں شیخ سعدی کے آفاقی پیغام سے براہِ راست فیض یاب ہو سکتا ہے، اور یہی پہلو اسے محض ایک ترجمہ نہیں بلکہ ایک اہم علمی و تہذیبی خدمت بنا دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاعری کی نئی بہار، پوڑی ساندل بار مع رسالہ نہر غلام مرتضیٰ علی نسخہ مملوکہ معظم علی شاہ، ص ۱۴

۲۔ فضل الٰہی حکیم، نور محمدی، لاہور: علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۰ء، ص ۱۱۸

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۴۔ ایضاً

۵۔ حکیم فضل الٰہی کے بیٹے، حکیم ظہور الٰہی کی ڈائری میں لکھی ہے۔

۶۔ فضل الٰہی حکیم، گلستان سعدی منظوم پنجابی، لاہور: حاجی چراغ دین ۱۹۳۸ء، ص ۳۲۰

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً، ص ۱۴

۹۔ ایضاً، ص ۱

۱۰۔ یضاً، ص ۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۳

۲۰۔ فضل الٰہی، حکیم، (۱۹۳۸ء)، گلستان منظوم پنجابی، ص ۸۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۹

۲۲۔ ایضاً، ص۱۴۶

۲۳۔ ایضاً، ص۱۵۲

۲۴۔ ایضاً، ص۱۸۴

۲۵۔ ایضاً، ص۲۰۵

۲۶۔ ایضاً، ص۲۴۱

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ ایضاً، ص۲۵۱

۲۹۔ ایضاً، ص۲۴۶

۳۰۔ ایضاً، ص۲۷۸

۳۱۔ ایضاً، ص۲۷۹

۳۲۔ ایضاً، ص۲۹۰

۳۳۔ ایضاً، ص۲۹۴

۳۴۔ ایضاً، ص۳۲۰

۳۵۔ ایضاً

جمیلہ ہاشمی کے ناولوں میں سیاسی محرکات: مختصر جائزہ

Political Motivations in the Novels of Jamila Hashmi: A Brief Review

ڈاکٹر محمد ثقلین* / افراء تسنیم**

Abstract:

This paper explores the life, literary contributions, and thematic concerns of Jamila Hashmi, one of Pakistan's distinguished female novelists. Born in 1929, Hashmi's experiences of migration, cultural dislocation, and socio-political upheaval profoundly shaped her fiction. Her novels Talash-e-Baharan, Dasht-e-Soos, and Chehra ba Chehra Rubaru portray the complexities of pre-Partition society, colonial tensions, and mystical personalities such as Mansur Hallaj and Qurrat-ul-Ain Tahira. Through strong female characters, historical reconstruction, and humanistic vision, Hashmi highlights issues of identity, freedom, spiritual conflict, and socio-political oppression. Her works remain vital to understanding Pakistani fiction's engagement with history, mysticism, and human values.

Key Words: Jamila Hashmi, Partition Literature, Mysticism in Fiction, Mansur Hallaj, Qurrat-ul-Ain Tahira, Colonial and Social Conflict

مشرقی پنجاب کے شہر امرتسر کے ایک گھرانے میں ۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو پہلوٹھی کی بچی نے جنم لیا جس کا نام والدین نے جمیلہ رکھا والدین اِس بات پر لاعلم تھے کہ ان کی یہ بیٹی بڑی ہو کر دُنیائے ادب میں بڑا نام پیدا کرے گی۔ جمیلہ کی پیدائش تو گوجرہ میں ہوئی مگر اس کے والدین امرتسر کے رہنے والے تھے۔ جمیلہ ہاشمی بہن بھائیوں میں

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج لالیاں، چنیوٹ

**(سی۔ٹی۔آئی) فارسی گورنمنٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین منڈی بہاوالدین

سب سے بڑی تھی اس لیے گھر میں ان کا بڑا رعب تھا تقسیمِ ہند کی وجہ اس کے خاندان کو ہندوستان آنا پڑا یہاں آ کر ان کا گھرانہ ۱۹۴۷ء میں ساہیوال میں منتقل ہو گیا۔ ۱۸ اگست ۱۹۵۹ء میں ان کی شادی بہاولپور کے مشہور خانقاہ کے سجادہ نشین اور صوبہ پنجاب کے ایم بی۔ اے سردار احمد اویسی سے ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے کراچی میں رائٹرز کنونیشن میں شرکت کی اس کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

> "۱۹۵۹ء کے دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور نئے سال کا سورج نئی اُمنگوں اور ولولوں کے ساتھ طلوع ہونے کے لیے تیار تھا انہیں تاریخوں میں کراچی میں رائٹرز کنونشن ہوا جس وقت کراچی متحدہ پاکستان کا دارالحکومت تھا اور مشرقی پاکستان ہمارے جسم قومی میں دل کی طرح دھڑکتا تھا ادیبوں کے کنونشن کے سلسلے میں میرے اور قرۃ العین کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ بعض ادیبوں کو کراچی اسٹیشن سے لا کر انہیں ان کی قیام گاہ تک پہنچانا تھا۔ انہیں ادیبوں میں سفید چادر میں لپٹی ایک صحت مند نوجوان سی لڑکی بھی تھی۔"(۱)

جمیلہ ہاشمی اُردو کی چند نمائندہ ناول نگار خواتین میں شمار ہوتی ہیں انہوں نے اپنے فنی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اس کے بعد انہوں نے ناول بھی لکھے۔

جمیلہ ہاشمی کا ناول 'تلاشِ بہاراں' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں تقسیمِ ہند سے پہلے کی مشترکہ تہذیب کو پیش کیا گیا۔ مصنفہ نے بے شمار کرداروں کی دُنیا میں سے چند ایک کرداروں کی مدد سے ناول کے ارتقائی عمل کو فروغ دیا ہے۔ ناول کے اہم کرداروں میں کنول کماری، ٹھاکر، شوبھا، راجندرا اور ایک ہندو اخبار نویس شامل ہے اس ناول میں مصنفہ کی انسان دوستی کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے وہ رنگ و نسل، مذہب اور ملت سے بالاتر ہو کر انسانیت کی بقا کے بارے میں فکر مند ہیں۔ وہ کرداروں کے ذریعے تقسیم سے قبل کے دانشور طبقے کے ذہن کی عکاسی کرتی ہیں۔

ڈاکٹر محمود الرحمن تلاش بہاراں کی اہمیت کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "۔۔۔۔ مرحومہ اعلیٰ پائے کی ناول نگار اور کہانی کار تھیں تلاشِ بہاراں ان کا پہلا ناول تھا جو ۱۹۵۴ء۔ ۱۹۵۵ء کے دوران میں لکھا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی اپنی پہلی ہی تخلیق کی بدولت موصوفہ نے شہرتِ دوام حاصل کر لی جو ان کی فنکارانہ صلاحیت کی دلیل ہے انہیں اِس ناول پر آدم جی ادبی ایوارڈ بھی ملا۔"(۲)

کنول کماری ٹھاکر ایک بہادر، باہمت اور محنتی عورت ہے وہ زمانے کے نشیب و فراز سے مکمل آگاہ ہے اس میں خود اعتمادی بدرجہ اتم موجود ہے وہ ایک ایسی سیاسی کارکن ہے جو شہرت سے مبرا ہے وہ اپنے نظریات کا پرچار بڑے دلکش انداز میں کرتی ہے اس کے خیال میں رنگ و نسل کی تقسیم انسانیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ بلا تفریق مذہب سب کو مساوی حقوق دلوانا چاہتی ہے اُس کا واضح ثبوت اُس وقت ملتا ہے جب فسادات شروع ہو جاتے ہیں اس کو انسانیت سے بہت پیار ہے چاہے وہ جس بھی سیاسی نظریے کے حامی ہوں۔

''ملک کی حالت اتنی دگرگوں ہے ہندو مسلم فسادات ہونے والے ہیں کانگریس اور مسلم لیگ۔۔۔۔ اتنی بات۔۔۔۔ کیا کوئی ایسا نہیں جو اِن حد بندیوں سے الگ ہو محض انسانیت کے لیے کام کرے کوئی ایسا نہیں جو اپنے ذاتی مفادات کو علیحدہ کر کے صرف انسان بن کر اِن سارے اختلافات کو مٹانے کی کوشش کرے۔۔۔۔''(۳)

'تلاشِ بہاراں' کی کہانی اس دور میں لکھے جانے والے بیشتر ناولوں کی طرح آزادی کے گرد گھومتی ہے اس کا عروج بھی ۱۹۴۷ء کے فسادات کا زمانہ ہے گویا یہ ناول تقسیم کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالسلام کے بقول:

''اس کتاب کا نام بہت موزوں ہے آزادی کے متوالوں نے اپنے تن من دھن کی بازی لگا کر آزادی کے جو خواب دیکھے تھے اس کی تعبیر وہ فرقہ وارانہ فسادات تھے جو اعلانِ آزادی کے ساتھ ساتھ سارے ملک میں پھیل گئے۔''(۴)

'تلاشِ بہاراں' میں مصنفہ نے کولونیل عہد کے جبر اور سیاسی غلامی کا پردہ بھی چاک کرنے کی کوشش کی ہے جنہوں نے ہندو مسلم دونوں کے اندر مذہبی جذبات کو بھڑکایا اور ایسی نفرت اور کشیدگی کی آگ بھڑکائی جس نے ہندو مسلم دونوں کو تباہ کر دیا۔ انگریزوں نے جہاں ایک طرف مسلم لیگی رہنماؤں کو اندرونی طور پر غلط مشورے دیئے وہاں ہندوؤں کے کٹر طبقے کو مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں مدد فراہم کی۔ تقسیم کے وقت انسان نے کس طرح اپنے جانور ہونے کا ثبوت دیا اس کی مثالیں 'تلاشِ بہاراں' میں جگہ جگہ دستیاب ہو جاتی ہیں۔ مصنفہ نے اِس انتشار کو یوں بیان کیا ہے:

''غیر ملکیوں نے اپنا داؤ چلایا تھا اس کا وار خالی نہیں گیا صدیوں سے ساتھ رہنے والے پھوٹ کی وجہ سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ مسلمان اور ہندو کا سوال، ایک تمدن کا سوال، الگ ملک کا سوال درپیش تھا اور جذباتی عوام ایک مذہبی رنگ دے رہے

تھے راجپوتانا کے شیر ببروں نے اکبر اور اورنگ آباد کے درباروں میں ہندو اور مسلمان سر جوڑ کر حکومت کے مسائل پر غور کر رہے تھے۔ پھر غلامی کا ایک دور آیا انگریز نے ملک کو تباہی کے بیج بو کر کاٹنے کے لیے تیار کر لیا تھا ہر روز جلسے ہوتے جلوس نکالے جاتے اور مادرِ ہند کے حصے نجرے کے لیے تیاری ہونے لگی۔۔۔۔"(۵)

جیلانی کامران کا یہ اقتباس 'تلاشِ بہاراں' کی تفہیم میں کافی مدد گار ہو گا:

"تلاشِ بہاراں' میں متعدد سیاسی اور سماجی تضادات کی دُنیا میں پُر معنی اور خوبصورت مستقبل کو جھانکنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے مشاہدے کا میدان مختلف ہے اس کی سوچ انسانی فطرت کی ہمدرد ہے اور اس سے محبت بھی کرتی ہے۔۔۔۔"(۶)

جمیلہ ہاشمی کا ناول 'دشتِ سوس' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا اور منظرِ عام پر آتے ہی علمی و ادبی دُنیا میں اسے بڑی پذیرائی ملی۔ یہ ناول حسین بن منصور حلاج کی شخصیت کا مطالعہ بھی ہے اور اُس دور کی سیاسی زندگی کا عکاس بھی۔ حسین بن منصور حلاج وہ متنازعہ صوفی ہے جس نے جوشِ محبت میں 'انا الحق' کہا اور تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا لیکن وہ اپنے عشق کی بدولت لازوال ہو گیا۔

بغداد کا یہ درویش صوفی حسین بن منصور حلاج ۸۵۸ عیسوی میں ایران کے شہر طوس میں پیدا ہوا۔ ابتداء ہی سے اس کے خیالات غیر روایتی اور شاعری باغیانہ تھی اس نے اسی لیے قرآن پاک کی نئی تفسیر کی کچھ لوگ اُس پر شعبدہ بازی کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ شریعت کے معاملات میں وہ حضرت سہیل تستری کا شاگرد تھا پھر المکی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا بعد ازاں جنید بغدادی کے مدرسے گیا لیکن انہوں نے اسے دیوانہ قرار دے کر اپنے حلقے میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ بصرہ میں شادی کی اور وہیں پر کچھ عرصہ شیعیت کے زیرِ اثر بھی رہا۔ تصوف کے عقیدے کے حساب سے منصور وحدت الشہودی تھا بغداد میں اس پر برسرِ اقتدار معتزلہ فرقے اور اہلِ تشیع نے رعایا کو گواہ کرنے اور حکومت کے خلاف بھڑکانے کے الزام لگائے تو منصور خراسان چلا گیا پھر دوسرا حج کرنے کے بعد ہندوستان آیا ہندو فلسفہ کا مطالعہ کیا، پھر بدھ مت کا مطالعہ کیا۔ ۹۰۲ عیسوی میں مکہ میں تیسرا حج کرنے کے بعد بغداد واپس آ کر اپنے گھر میں منصور نے خانہ کعبہ کا ایک ماڈل بنایا۔ سیاسی طور پر یہ وہ دور تھا جب تمام عرب میں بغاوتیں ہو رہی تھیں اور نئے نئے فرقے عباسی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار تھے منصور کے غیر روایتی افکار اور اُس کے پیروکاروں کی تعداد سے حکومت تشویش کا شکار تھی اس لیے منصور کو نو سال قید میں رکھا گیا پھر اُس پر زندیق اور مشرک ہونے کا فتویٰ لگا کر ۹۲۲ عیسوی میں دجلہ کے کنارے مصلوب کر دیا گیا۔

'دشتِ سوس' میں جمیلہ ہاشمی نے ابن منصور کے عہد کے سیاسی اور سماجی انتشار اور بغداد کی سیاسی زندگی کا جیتا جاگتا مرقعہ پیش کیا ہے اس عہد کے سیاسی انتشار کا ایک نقشہ ملاحظہ کریں:

> "اس کے (خلیفہ متوکل اللہ) مشیروں کی طرح اس کے بیٹے بھی عزت و جاہ اور دولت کے دیوانے تھے وہ اپنے ضمیر اور دماغ میں کسی مفاہمت کے قائل نہ تھے بے خود، بے بصر اور بے ضمیر اُن میں اپنے اجداء کی اس سلطنت کے لیے اُٹھائی ہوئی سختیاں بھول چکی تھیں وہ متوکل کے خلاف ساری ریشہ دوانیوں میں کسی نہ کسی طور شریک تھے۔ مامون کے وقتوں میں بلکہ اس سے بھی پہلے یونانی فلسفہ کے تراجم عرب و عجم کے عقائد کی صورت کو بالکل بدل دیا تھا۔ رواداری ایک حد تک تو ایک دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کے لیے بہت ضروری تھی مگر پھر آندھی سی چلی جس میں پوری زندگی ریت کے ٹیلوں کی طرح یہاں منتقل ہوئی تھی آزادئ رائے تو قابل قدر تھی مگر زیادہ آزادی بے راہ روی بن گئی تھی نئے نئے فتنے یہاں وہاں بھڑکنے والی آگ کی طرح جلتے اور بجھتے رہتے تھے پھر آلِ علی تھے جو خلافت کے مدعی تھے اور اِن کی دعوات گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھرتے نامانوس راستوں سے سفر کرتے۔ راتوں کو بستیوں میں وارد ہوتے اور اپنے معاونین کے گروہ ترتیب دے رہے تھے ان کی دلائی ہوئی جسارتوں سے ہوشیار ہو کر کئی جھوٹے نبی پیدا ہو کر اسلام میں رخنہ اندازی کرتے تھے اسلام ایک ایسی عمارت کی طرح ہو گیا تھا جس میں دریچے ہی دریچے ہوں اور یوں دیوار کمزور ہو گئی تھی۔۔۔۔"(۷)

حسین بن منصور حلاج کے مدمقابل کی حیثیت سے حامد بن عباسی بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ گوناگوں صلاحیتوں سے مزین ہے جس کا اندازہ کسی حد تک اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ریاست کے ایک ادنیٰ اور معمولی کارندے کے حیثیت سے ترقی کرتا کرتا وزیر اعلیٰ کے عہدے تک پہنچ گیا اس نے خلیفہ وقت کو اپنی فہم و فراست کو کام میں لا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مغرب میں المہدی کے خلاف سیاسی اور جنگی محاذ پر ناکامیوں اور اپنے بیٹے حسین کی طرف سے مایوسی کے سبب کہ وہ اس کی تربیت جن خطوط پر کرنا چاہتا تھا نہ کر سکا اور دیار غیر میں مر گیا۔

حامد بن عباس کے بہیمانہ، سفاکانہ اور ہیبت ناک عمل کا محرک وہ جذبۂ انتقام ہے جو وہ حسین بن منصور حلاج کے خلاف اتنی شدت کے ساتھ محسوس کرتا تھا حسین اور حامد کے درمیان رقابت کی خالص وجہ انمول تھی جو حسین سے محبت کرتی تھی۔ حسین سے حامد کی نفرت کا ثبوت حسین بن منصور کا بہیمانہ قتل ہے۔

''حامد نے چیخ کر کہا، جاؤ اور اس کے جسد خاکی کو جلا دو، خاک اُڑا دو، اس کی انا کو میں نے قتل کر دیا ہے اب وہ کیسے حق کو پکارے گا' پھر وہ رقص کرنے لگا' عمار نے سوچا حامد بن عباس وزیر مملکت دیوانہ ہو گیا ہے پھر وہ بھاگا اُس نے خلقت کے ہجوم کو چیر کر راستہ بنایا پل کے ایک حصے کو توڑ کر جمع کیا اس کٹے ہوئے سر بدیدہ لاشے کا ان مثلہ کیے ہوئے بازوؤں اور پاؤں کو اُس ڈھیر پر رکھ کر آگ لگا دی ہجوم برابر نعرے لگا رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا اور ہوا میں شعلے اور چنگاریاں اور ذرے انا الحق پکار رہے تھے۔''(۸)

حسین کی بڑھتی ہوئی شہرت میں حامد بن عباسی کو اپنا اقتدار خطرے میں پڑتا محسوس ہو رہا تھا دوسرا اغول کی محبت کا مرکز بھی حسین تھا اسی بنا پر حامد حسین کو ہر حال میں پُر تشدد موت دینا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے بقول:

''حسین بن منصور حلاج زندان میں تھا اور اپنے انجام کا منتظر ایک دن قاضی ابو عمر نے وزیر حامد عباس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ منصور کو چھوڑ دے۔ حامد بن عباس نے پہلے ہی خلیفہ مقتدر سے اُس کے پروانے پر دستخط کروا لیے تھے اس کے خلاف فتوے پر دوسرے علماء مثلاً شبلی، ابن عطار اور دوسروں کے بھی دستخط تھے۔ شقی القلب حامد بن عباس نے منصور کی مدت کے پروانے اپنی قلم سے دار پر لٹکانے کے علاوہ دیگر سزائیں مثلاً سنگساری، پھر ایک ہزار کوڑے وغیرہ خود تحریر کی تھیں جس کا قاضی ابو عمر کو بہت شکوہ تھا۔ بہر صورت حامد بن عباس نے اپنی خواہش پوری کر لی اس نے حسین بن منصور حلاج پر قرامطی ہونے کا الزام لگایا اور اسے ختم کروا دیا۔''(۹)

آخری حصہ 'زمزمۂ موت' ہے اس میں ابنِ منصور کی سزائے موت کا بیان ہے۔ ابن منصور کی شخصیت ان تمام لوگوں کے لیے معمہ تھی جنہیں ان کی فکر تھی جو طریقت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے مثلاً سہیل بن عبد اللہ تستری اور جنید بغدادی وغیرہ۔ وہ حسین کے ساتھ ہمدردی کرتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ شخص بھٹکا ہوا ہے جس کا انجام سزائے موت کے سوا اور کچھ نہ تھا یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کا فائدہ خلیفۂ وقت اُٹھا لیتا تھا وہ اپنی سیاسی طاقت کو استعمال کر کے اپنی رقابت کا بدلہ لیتا ہے یہ رقابت اس حقیقت کے انکشاف سے شروع ہوتی ہے کہ حامد کی منظورِ نظر کنیز 'اغول' جسے اُس نے اپنے حرم میں شامل کر لیا تھا حسین بن منصور کے عشق میں مبتلا تھی اور

اپنی موت کے وقت ابن منصور کے قریب تھی۔ خلیفۂ وقت اِس انکشاف کو برداشت نہیں کر پایا اور ابن منصور کی ہلاکت کے لیے اپنی تمام ریشہ دوانیوں کو کام میں لاتا ہے اور بالآخر ابن منصور کو سزائے موت دی جاتی ہے۔

'چہرہ بچہرہ روبرو' قدیم ایران کے تناظر میں لکھا گیا ناول ہے اس کا موضوع ایران کی متنازعہ شخصیت قرۃ العین طاہرہ ہے جس کے بارے میں اس سے قبل عزیز احمد "زریں تاج" کے نام سے ایک بہت ہی خوبصورت اور عمدہ افسانہ لکھ چکے ہیں لیکن جمیلہ ہاشمی کا ناول بالکل مختلف ہے۔

ایران میں شاہِ قاچار کے زمانے میں پیدا ہونے والے ایک مذہبی فرقے کی سرگرمیوں کو ظاہر کیا ہے اور اس کے اہم کردار قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ پس منظر کے طور بابی فرقے کی فکری اور جذباتی صورتِ حال سامنے آتی ہے شیعہ مذہب کی رو سے قائم آل محمد کا ظہور ایک حقیقت ہے لہٰذا جب جب دُنیا فسق و فجور سے بھر گئی مہدی موعود کی آمد کا شدید بے چینی سے انتظار کیا گیا اور وقتاً فوقتاً لوگوں نے مہدی مدعود ہونے کا دعویٰ کیا جس میں مختلف فرقے ظہور میں آتے رہے ہیں اور بہت سے معصوم لوگ ان کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ 'چہرہ بچہرہ روبرو' ایران میں پیدا ہونے والی ایک ایسے ہی بابی فرقے کی داستان سناتا ہے۔ ام سلمٰی قزوین میں رہنے والے مجتہد خاندان کی بہو اور بیٹی ہے وہ عام لڑکیوں سے مختلف ہیں اس نے عام روایت کے خلاف تعلیم حاصل کی ہے ان کی شاعری کا ایک عالم میں چرچا ہے ساتھ ہی وہ حسن و ذہانت کا مجسمہ ہے اور موجودہ نظامِ حیات سے غیر مطمئن ہے وہ بڑی شدت سے ظہور آل محمد کی منتظر ہے وہ مسلسل ایک ہی خواب دیکھتی ہے جس میں ایک نقاب پوش دکھائی دیتا ہے وہ اِس نقاب پوش کا روئے زمین دیکھنے کی آرزو مند اُس کی شاعری کا مرکز و محور بھی وہی نادیدہ اور پردہ پوش محبوب ہے وہ اِس کی تلاش اور زندگی کا حاصل ہے لہٰذا اُس کا ذہن مختلف قسم کے فلسفیانہ خیالات کی آماجگاہ ہے وہ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کا حل چاہتی ہے۔

ام سلمٰی جو ایک منفرد اور غیر معمولی ذہن اور مزاج کی مالک تھی اسے اپنی گھریلو زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کے بچے اور شوہر جو اس کا عمزاد بھی تھا اس کے خوابوں اور خیالوں کا بدل نہ بن سکا۔ وہ سارے رشتے ناتوں کو بالائے طاق رکھ کر سید کاظم رشتی سے ملنے نجف اشرف چلی جاتی ہے لیکن اُس کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی کاظم رشتی کا انتقال ہو جاتا ہے اب کاظم رشتی کے مریدوں کو ایک رہبر کی تلاش تھی جو ان کے سوالوں کا جواب دے سکے اُس رہنما کی تلاش میں ملا حسین بشروئی جو سید کاظم رشتی اور شیخ احمد احسائی کے فلسفوں کا شیدائی تھا شیراز جاتا ہے شیراز میں اُسی کی ملاقات محمد علی سے ہوتی ہے۔ محمد علی 'باب' ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ملا حسین بشروئی نے باب کی تجلیاں دیکھیں اور اُن پر ایمان لے آیا اور 'باب الباب' کا خطاب پایا۔ نجف اشرف واپس آ کر اُس کے باب

کے یہاں جو دیکھا اور اسے بیان کیا فرقے کے چار اہم ستون بن جاتے ہیں۔ محمد علی (باب)، ملا حسین بشروئی (باب الباب)، محمد علی بار فروش جو اُن کے گروہ کا نوجوان فلسفی تھا وہ (جناب قدوس) تھا اور قرۃ العین باب کی (حرف حیٔ) تھی دن بہ دن اس گروہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا نئے مذہب کے دیوانے جن کا خدا ہی باب تھا اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کو عین سعادت سمجھتے تھے حکومتِ وقت کو اِس بڑھتے ہوئے فتنے کا اندازہ ہوا۔ جس کی تہہ میں سیاسی عزائم اور حکومت کے خواب تھے۔ عبادت و ریاضت کے پردے میں خدائی کے دعوے تھے باب قید کر لیا گیا۔ قرۃ العین طاہرہ کی اپنے محبوب سے ملنے کی حسرت پوری نہ ہو سکی اس کے دیدار کے لیے جب سفر کرتی اسے کہیں اور بھیج دیا جاتا۔

قرۃ العین طاہرہ کے کردار کی کئی جہتیں ہیں اس کا ایک خاص سیاسی پس منظر ہے اس کی فطرت کی خاص سوچ ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اس کردار کو اُس کے تاریخی پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے تاریخ کے کئی رنگ اس کی شخصیت پر لرزتے اور گم ہوتے رہتے ہیں کربلا کا پس منظر ہر وقت اس پس منظر میں زندہ استعارہ کے طور پر موجود ہے۔

جب بابیوں کی تنظیم و تبلیغ کی لَے خطرناک حد سے تجاوز کر گئی تو اُن کو بغداد سے ترکِ وطن کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ نہایت سرعت کے ساتھ ایک نئے مرکز کی شکل میں اُبھر رہے تھے حکومت نے 'باب' کو ماکو میں قید کر دیا اور اُس کے پیروکار عرب و عجم کے سرزمین پر بغاوتیں کر رہے تھے اس لیے بابیوں پر ہر قریے اور ہر خطے میں زمین تنگ کر دی گئی۔ علماء اور مجتہدین قرۃ العین کے عورت ہونے کی بنا پر اُس کے دشمن بنے ہوئے تھے۔

> ''کرمان شاہ میں عُلما چڑ گئے تھے۔ ملا اُس سے رواداری کا سلوک کرتے تھے انہوں نے اس کے باپ کو ایک برق رو قاصد کے ہاتھ پیغام بھجوایا کہ وہ علمی صلاحیت نہیں دیوانگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہ کوئی مذہب نہیں قرآنِ پاک کی آیات کی تاویلیں ہیں ماکو میں باب کے پاس جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اب اسے آ کر لے جائیں۔''(۱۰)

حوالہ جات

۱۔ الطاف فاطمہ، دستک نہ دو، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۱ء، ص ۶۸۶

۲۔ جمیلہ ہاشمی (اُردو کی مایۂ ناز ادیبہ)، مشمولہ ماہنامہ اخبار اُردو، جلد نمبر ۵، شمارہ نمبر ۲۰، فروری ۱۹۸۸ء

۳۔ جمیل جالبی، گوشہ ادب، اخبارِ جہاں، ۱۵ جنوری ۱۹۸۸ء

۴۔ جمیلہ ہاشمی، تلاشِ بہاراں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۳۲۸

۵۔ عبد السلام، پروفیسر، اُردو ناول بیسویں صدی میں، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۳ء، ص ۷۰

۶۔ جمیلہ ہاشمی، تلاشِ بہاراں، ص ۲۷۰

7. Memorial Lines for Jamila Hashmi, The Nation Lahore, 25 Jan, 1988.

۸۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۶۱ تا ۶۳

۹۔ ایضاً، ص ۴۹۲

۱۰۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے بدلتے تناظر، کراچی: ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۱۱

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ترجمہ شدہ کتاب ''جنم دن'' کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study of the Translated Book "Janam Din" by Professor Zia-ur-Rehman Siddiqui

غزالہ نورین* / ڈاکٹر صدف نقوی**

Abstract:

Professor Ziaur Rahman Siddiqui holds a distinct place in the literary world. He is a renowned scholar, insightful critic, and intellectual, as well as a successful and trustworthy translator. "Janam Din" is a testament to Professor Siddiqui's balanced and skilled approach to translation. Indeed, translation is a serious and challenging art. Transferring a text into another language while retaining its literary richness, emotional impact, and original essence is no less than drawing blood from stone. Yet, the professor has accomplished this task commendably, with his artistic finesse, symbolic insight, and complete mastery over language and expression.

"Janam Din" is an engaging collection of eight stories. Among these, Janam Din, Bhadari, and Phoolon Ka Mol are translations of Malayalam, Assamese, and Bengali stories respectively. The remaining five stories — Kubda Bhikhari (The Hunchback Beggar), Marg-e-Shajar (The Death of a Tree), Achhoot (The Untouchable), Khwahish (Desire), and Junoon (Madness) — are translations of stories by Ruskin Bond.

There is a charm in Professor Ziaur Rahman Siddiqui's style that

*ایم۔فل اسکالر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

**صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

captivates the reader. His writings are proof that he has richly infused the aesthetics of Urdu literature into his work. His texts display a beautiful blend of creative elegance and literary flavor, which even a general reader finds interesting. The literary delicacy and simplicity in his language reflect the true aesthetic values of Urdu. One of the strengths of his translations is that he embellishes even dry and difficult subjects with aesthetic qualities, adding a unique beauty to them.

A major characteristic of his translation work is fluency, simplicity, and clarity. He has expressed even the most complex subjects in such plain and accessible language that readers not only understand them easily but also form a deep connection with the themes. His style proves that one can convey strong and impactful ideas in literature without relying on complexity or exaggeration. Professor Siddiqui's translations have made things much easier for readers — both in terms of readability and comprehension.

Keywords: Ziaur Rahman Siddiqui, Translation, Urdu Literature, "Janam Din"

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ادبی دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت کے حامل ہیں۔وہ ایک ممتاز، محقق، صاحب بصیرت ناقد اور دانشور کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب اور قابل اعتماد مترجم بھی ہیں۔"جنم دن" پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کو متوازن ترجمہ نگاری پر دال ہے۔یقیناً ترجمہ نگاری ایک سنجیدہ اور مشکل فن ہے۔کسی بھی متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنا وہی ادبی رچاؤ وہی اثر اور وہی جذبہ برقرار رکھنا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔لیکن موصوف نے اپنی ترجمہ نگاری میں فن کاری، رمز شناسی اور زبان وبیان پر کامل دسترس کے امتیاز سے یہ کارنامہ بھی بخوبی انجام دیا ہے۔"جنم دن" آٹھ کہانیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔جس میں جنم دن، بھداری اور پھولوں کا مول بالترتیب ملیالم، آسامی اور بنگالی کہانیوں کا ترجمہ ہے۔اور باقی پانچ کہانیاں یعنی "کبڑا بھکاری"، "مرگ شجر"، "اچھوت"، "خواہش" اور "جنون" رسکن بونڈ کی کہانیوں کے تراجم ہیں۔

مجموعہ میں شامل پہلی کہانی "جنم دن" میں بھوک اور افلاس میں مبتلا ایک مصنف کی خستہ حالی کو بیان کیا گیا ہے۔جو اپنے جنم دن پر بھوک کا شکار رہتا ہے۔اور اس بھوک کو مٹانے اور اپنے جنم دن پر خوشی واطمینان حاصل

کرنے کے لئے مختلف خیالات اور تدابیر کے باوجود بھی پریشان اور مایوس ہی رہ جاتا ہے۔ دراصل ااس کہانی کے مرکزی کردار کے ذریعے دنیا کے تمام ناداروں، مفلسوں بے بس و بے سہارا عوام کی حالت زار کو صاحب ثروت کے زیر نظر لانے کی سعی کی گئی ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے بڑی خوش اسلوبی سے نفس مضمون کو من و عن پیش کیا ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے انہماک و انجذاب سے متن اور مصنف کے شعور کی تفہیم کے ساتھ قارئین کو اصل حقیقتوں اور معنوی تہوں سے باخبر کرنے کے علاوہ مرکزی کردار کی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کا بااثر انکشاف کیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ سادہ اور پر کشش ہے۔ شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اور بغیر کسی اکتاہٹ کے قاری کہانی کے حدود جزر سے حذ حاصل کرتے ہوئے زندگی کے تلخ تجربات سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ یوں منظم اور مربوط پلاٹ کے سہارے قاری کو دعوت فکر دی گئی ہے۔ کہانی کا موضوع افلاس و محتاجی ہے۔ وہ افلاس جس نے سماج کے باشعور اور حساس طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار سی خاص طبقے کا ایک باشعور شخص ہے۔ جو اپنے سماج کے حالات و واقعات پر خامہ فرسائی کر کے سماجی حالات کو بہتر بنانے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ لیکن وہ خود کن حالات سے دوچار ہے۔ اس سے کسی کو کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ مصنف نے مرکزی کردار کے ذہنی و جسمانی اضطراب و خلفشار کی ترجمانی میں جس بیض شناسی اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔ مترجم نے اس کو ہو بہو منتقلی اور اثر آفرینی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ مترجم نے اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے کہانی کو اصل انگریزی کے زیادہ قریب کیا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ”سات بجے تھے مجھے یاد آرہا ہے کرسی پر آرام سے بیٹھے ہوئے میں نے سوچا، کم سے کم مجھے اس روز کسی غلط کام سے بچنا چاہیئے۔ اور آج کوئی غلط بات نہیں ہونی چاہیئے۔ آج کے "میں" کو میرے ان سینکڑوں رنگ بدلتے چہروں سے بالکل مختلف ہونا چاہیئے۔ جو ماضی کے سفید و سیاہ شب و روز میں نظر آرہے ہیں۔ آج میری عمر کتنی ہو گئی؟ پچھلے سال کے مقابلے میں ایک اور برس بڑا ہو گیا ہوں۔ پچھلے سال چھبیس (۲۶) نہیں بتیس (۳۲) یا سینتالیس (۴۷)۔“(۱)

مندرجہ بالا اقتباس میں مترجم نے منظر کشی بھی نہایت سلیقے سے کی ہے۔ سات بجے کا وقت بتایا ہے اور جس طرح سے کرسی پر بیٹھنا اور اس کا سوچنا بیان کیا گیا ہے یہ ایک اچھا مترجم ہی بیان کر سکتا ہے۔ اقتباس میں لفظ "میں" مترجم کی علمیت کو ظاہر کرنا ہے۔ مصنف نے جس طرح سے ترجمہ کیا ہے اس کا دونوں زبانوں پر عبور ہے۔ جس طرح کا نمونہ مندرجہ بالا اقتباس میں پیش کیا گیا ہے۔ باقی ساری کہانیوں سے بھی اس طرح کا صاف انداز

بیان ہے۔ ترجمہ نگاری کے لئے ایک مشکل یہ بھی ہوئی ہے۔ کہ ترجمہ کرتے ہوئے منشائے مصنف کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات اور خیالات کو الگ نہیں رکھ سکتا۔ دو زبانوں کے درمیان ترجمہ نگار اپنی ذات کو الگ نہیں رکھ سکتا۔ اس طرح اصل متن کی عبارت کی تفہیم میں بعض اوقات مترجم خود ایک رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مترجم اپنی ذہنی صلاحیت، رجحانات، ماحول اور تہذیبی پس منظر کے لحاظ سے عبارت کا مفہوم سمجھتا ہے اور اسی طرح عبارت کا ترجمہ بھی کرتا ہے۔ تراجم کی تاریخ میں مترجمین حضرات کی غلطیوں نے نا صرف سادہ نثر بلکہ بڑے مفکرین کی عبارات کا مفہوم کچھ کا کچھ کر دیا اور کافی عرصے کے بعد ان غلطیوں کی اصلاح ممکن ہو سکی۔ اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے ترجمے کی بات کی جائے تو وہ باوجود کہیں کہیں اپنے حشو زوائد کے بہترین ترجموں کی فہرست میں آتا ہے۔ اگر ترجمہ نگار خالصتاً ترجمہ نگاری کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کرے تو ترجمہ میں بہت سی مشکلات مزید آجائیں گی۔ جبکہ مترجم کو کسی حد تک آزادی بھی ہوتی ہے۔ کہ وہ منشائے مصنف کو تبدیل کئے بغیر اپنے الفاظ و مفاہیم میں دوسری زبان میں منتقل کر دے۔ کہیں کہیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا ترجمہ لفظی ترجمے سے بھی قریب تر ہو جاتا ہے۔ وہ منشائے مصنف کو پوری طرح دھیان میں رکھتے ہیں۔ اور لفظ بہ لفظ ترجمے میں لے آتے ہیں۔

دوسری کہانی "بھداری" کے عنوان سے ہے۔ بھداری جو ششورام کی باوفا بیوی ہے۔ اپنے تلخ و تند شوہر کی تمام تر سختیوں اور مظالم کو ہنسی خوشی برداشت کرتی ہے۔ ایک دن جب ششورام کھیت سے گھر لوٹتا ہے تو بھداری سے کھانا طلب کرتا ہے۔ گیلی لکڑیوں کے سبب کھانا تیار نا ہو سکا تھا۔ تو ششورام کے منہ سے بھداری اور اس کے خاندان سے متعلق تلخ و ترش الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں میاں بیوی کے درمیان جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ اور بھداری اپنے شوہر کے ہاتھوں زخمی ہو جاتی ہے۔ اور اسپتال میں داخل کی جاتی ہے۔ اور ششورام کو قید کر دیا جاتا ہے۔ لیکن بھداری جو اپنے شوہر کی وفادار اور وفا شعار بیوی ہوتی ہے۔ اپنے شوہر کے جرم کو معاف کر دیتی ہے اور یہ بیان دیتی ہے کہ میں خود کیا درانتی سے ٹکرا گئی اور زخمی ہو گئی تھی۔ یہ سن کر ششورام پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور خود کو مجرم قرار دے کر پھانسی کے لائق سمجھتا ہے۔ ششورام کو تین ماہ قید کی سزا سنائی جاتی ہے۔ تو بھداری خود کو اس سب کا قصوروار سمجھ کر اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتی ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کہانی کو اردو کا جامہ پہنا کر اس کی روح کو و قارئین کے ذہن و دل پر منعکس کیا ہے۔ موصوف نے اپنے ترجمے میں کرداروں کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیات کو تمام تر جزئیات کے ساتھ سامنے لایا ہے۔ سادہ اور سلیس انداز بیان میں کہانی کو مؤثر بنا کر یہ باور کیا ہے کہ کس طرح معاشی پسماندگی سے پیدا شدہ حالات ایک انسان کو جھنجھوڑ کر ظالم

اور بے رحم بنا دیتے ہیں۔ موصوف نے اس نزاکت کو مکمل فہم و فراست اور فنکارانہ مہارت سے اردو کا جامہ کا پہنا کر ترجمہ نگاری کے فن سے پوری طرح انصاف کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس دیکھئے:

> ''بھداری چولہا پھونکتے پھونکتے عاجز آ گئی تھی۔ ششورام نے اس غضبناک آنکھوں سے دیکھا اور دور سے چلا کر کہا فلاں فلاں کی بچی تم نے ابھی تک کھانا کیوں نہیں بنایا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا دھوئیں سے منہ پھیرتے ہوئے بھداری نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ کیا میں اپنے سر سے کھانا بناؤں۔ گھر میں ایک بھی سوکھی لکڑی نہیں ہے۔ بغیر سوچے سمجھے تمہارا آپے سے باہر ہونا جائز ہے کیا کیا کہتی ہے کتیا کی بچی ششورام گرجا اور کندھے اچکاتا ہوا بھداری کی طرف لپکا اور زمین پر پڑی ہوئی درانتی اٹھا کر اس کی کمر پر مار دی۔ بے چاری بھداری خون میں لت پت بے ہوش پڑی تھی۔''(۲)

یہ مختصر کہانی اپنے وحدت تاثر اور جذبات نگاری کے سبب ایک عمدہ کہانی ہے۔ کردار نگاری میں مصنف نے احتیاط سے کام لیا ہے۔ بہتات کردار سے اجتناب کیا ہے۔ اور معاون کرداروں سے مناسب و موافق کام لیا ہے۔ مکالمے مختصر لیکن مؤثر اور جاندار ہیں۔ جن کے ذریعے کرداروں کی باطنی کیفیت اور ماحول و احوال کے ساتھ ان کی ذہنی نشو نما کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد ششورام کے منہ سے غصے کے وقت نکلنے والے الفاظ کی خوب نمائندگی کی گئی ہے۔ جو کہ دلچسپی میں اور انفرادیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ اسلوب بیان کی انفرادیت مترجم کو دوسروں سے منفرد بناتی ہے۔ ہر مترجم اپنے زبان و بیان اور جملے کی ساخت و پرداخت کے اعتبار سے دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے ہاں واقعات کے بیان کرنے کا اور منظر نگاری کرنے کا اپنا انداز پایا جاتا ہے۔ کسی بھی کہانی میں منظر نگاری سے انداز بیان میں چاشنی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ کہانی میں منظر نگاری صورتحال کا سہارا دیتی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ منظر کشی کہانی کی اہمیت اور افادیت پر اثر انداز بھی ہو سکتی ہے۔ کہانی مختصر ہونے کے لحاظ سے کرداروں کے درمیان مکالمے بھی مختصر ہیں۔ لیکن مؤثر و جاندار ہیں۔ مصنف نے زیادہ کرداروں سے اجتناب کیا ہے اور معاون کرداروں سے کام لیا ہے۔

تیسری کہانی "پھولوں کا مول" میں لندن کے ایک ریستوران میں مسٹر گپتا کی ملاقات منگی سے ہوتی ہے۔ جس کا بھائی ہندوستان میں بحیثیت فوجی مامور اور بہت عرصے سے خط و کتابت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ماں اور بہن بہت پریشان ہیں۔ منگی مسٹر گپتا کو اپنی ماں سے ملاقات کی خاطر اپنے گھر کے ساتھ لے جاتی ہے۔ تاکہ ماں کو

ہندوستان کے حالات و واقعات سے آگاہ کر کے اس کی پریشانی کو کئی حد تک دور کر سکے۔اس کہانی میں مصنف نے مذہبی اعتراضات اور توہم پرستی کی پر کشش ترجمانی کی ہے۔جس کو مترجم نے بڑی ہی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔نا صرف اتنا ہی بلکہ موصوف نے جذبات نگاری میں بھی اپنے فن کاری کا مظاہرہ کر کے ترجمے کو زوردار بنا دیا۔موصوف نے توہم پرستی اور ضعیف الاعتقاد سے پیدا ہونے والی نفسیاتی و ذہنی کیفیت کو بھی منفرد انداز و اسلوب میں بیان کیا ہے۔

> ”فرینک نے جب یہ انگوٹھی بھیجی تھی مسز کلفرڈ نے کہا اس سے اس انگوٹھی کے بارے میں لکھا تھا اس کو دیکھتے وقت کسی دور افتادہ شخص کے بارے میں دھیان دو گے۔تو تمہیں یہ معلوم ہو جائے گا۔کہ وہ آدمی کیا کر رہا ہے۔یہ باتیں فرینک کو یوگی نے بتائی تھیں۔“(۳)

اس اقتباس کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔کہ جیسے مصنف نے کہانی لکھتے ہوئے محنت و ریاضت سے کام لیا ہے۔اسی طرح مترجمنے بھی خوب محنت اور لگن سے ترجمہ کیا ہے۔مصنف کا کام ہوتا ہے کہانی لکھنا اور مترجم اس لکھی ہوئی کہانی کو ترجمہ کر کے دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ہر مترجم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ آسان سے آسان لفظوں میں ترجمہ کر کے قارئین تک پہنچائے۔مترجم اصل کہانی کے متن سے دور نہیں ہو سکتا۔مترجم ترجمہ کر کے کہانی کو مزید دلچسپ بنا رہا ہے۔جس طرح وہ ترجمہ کرے وقت منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کو بہتر طریقے سے پیش کرتا ہے۔ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ہم ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ایسا ہی لگتا ہے کہ اصل کہانی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے کہانی کو مزید دلچسپ اور جاندار بنا دیتے ہیں۔اور ترجمہ کرتے وقت مشکل الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔اس مختصر کہانی میں مصنف نے مذہبی اعتقادات اور توہم پرستی کی پر کشش ترجمانی کی ہے۔جس کو مترجم نے بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔اور صرف اتنا ہی نہیں مترجم نے جذبات نگاری میں بھی اپنی فنکاری کا مظاہرہ کر کے ترجمے کو زور دار بنا رہا ہے۔مترجم نے ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو بھی منفرد انداز و اسلوب میں بیان کیا ہے۔ایک کامیاب مترجم ہی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو بیان کر سکتا ہے۔اور کہانی کی مکمل گہرائی کو قارئین تک ایک بہتر ترجمے کے ذریعے پہنچا سکتا ہے۔مترجم اپنی پوری کوشش کرتا ہے۔کہ کہانی کا گہرا مطالعہ کر کے اس کو آسان کر کے دوسروں تک پہنچائے تاکہ دوسروں کے لئے مصنف کی بات سمجھنے میں آسانی ہو اس مختصر سی کہانی میں ہندوستان کے حالات و واقعات بھی بتائے گئے ہیں۔اور مسٹر گپتا اور میگی کی ملاقات کا بھی منظر بیان کیا گیا ہے۔کہ وہ کس طرح ایک ریستوران میں ملتے ہیں۔اور میگی اسے گھر لے جا کر اپنی ماں سے بھی ملواتی ہے۔

"کبڑا بھکاری" ایک نصیحت آموز اور دلچسپ کہانی ہے جس میں ایک گنپت لوگوں کو کہانیاں سنا کر پیسے حاصل کرتا ہے جسے بھیک مانگنے کا نیا طریقہ کہا گیا ہے۔ گنپت لکھا پڑھا آدمی ہے لوگوں کو اس کے بھیک مانگنے پر شک ہے اور اس سے متعلق بہت سی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں اور لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ افواہیں گنپت خود پھیلاتا ہے۔ گنپت تین کہانیاں ایک نوجوان کو سناتا ہے۔ وہ بعد از عقل اور ناقابل یقین ہے۔ مگر اس کہانی سے جو نصیحتیں اسے ملتی ہیں۔ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ مثلاً انسانوں سے محبت کرنا دشمن پیدا ہی نہ کرنا، خوہشات کے پیچھے نا بھاگنا، وقت کی قدر کرنا، اور ایمانداری سے ہر کام انجام دینا وغیرہ۔ کہانی کا مرکزی کردار گنپت راوی کو اپنی کہانی سناتا ہے۔ جس کے عوض راوی سے ایک روپیہ دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ گنپت کی کہانی بڑی دلچسپ ہے جس کے ذریعے اس وقت کی سماجی زندگی اور ایمان و اعتقاد کے ساتھ ساتھ فطرت انسانی عناصر سامنے آجاتے ہیں جو ہر کسی شخص میں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ یعنی بغز، حسد، لالچ، شک وشبہ وغیرہ۔

> "میرے پاس پیسے آنے شروع ہو گئے اور اتنے پیسے آ گئے کہ میں نے بہت سی زمین اور مویشی خرید لئے۔ اس راز کو کسی کو نہیں پتا تھا ظاہر ہے کہ میرے دوستوں اور رشتہ داروں کو حیرت تھی کہ میرے پاس اتنا پیسہ اچانک کہاں سے آ گیا۔ ادھر میری بیوی بھی پریشان تھی کہ میں اس سے الگ کیوں سوتا ہوں۔ اس نے گھر کے اس بارے میں دوسرے لوگوں کو بتایا دوسرے دن میرے سسرال کے کچھ لوگ میرے گھر آ گئے اور انہوں نے گھر سے باہر مویشی خانے میں سونے کی وجہ معلوم کی۔ چاچا، چاچی، بھائی، بھتیجے اور گاؤں کے دوسرے لوگ بھی یہی جاننے کے خواہش مند تھے کہ میرے پاس اتنی دولت کہاں سے آرہی ہے۔ اور ابھی وہ اس دولت کا کچھ حصہ (لینے) لینا چاہتے تھے۔"(۴)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کہانی کے سیاق و اسباق کو اردو کے قالب میں ڈھال کر مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔ اور قارئین کے لئے سبق آموز باتیں سلجھے ہوئے انداز و اسلوب میں بیان کی گئی ہیں۔

یہ کہانی دلچسپ اور سبق آموز کہانی ہے۔ کہانی مرکزی کردار گنپت کے گرد ہی گھومتی ہے۔ گنپت کا چہرہ وجیہہ، آنکھیں بارعب اور لمبی سفید داڑھی تھی۔ اور آواز میں بہت جان تھی۔ گنپت ایک فقیر تھا۔ اور اس کا مانگنے کا طریقہ دوسرے بھکاریوں سے مختلف تھا۔ یہ لوگوں کو کہانی سنا سنا کر پیسے اکٹھے کرتا تھا۔ اس کی انگریزی بھی اچھی تھی۔ یہ لوگوں کو شیکسپیئر کے کچھ بند بھی سنایا کرتا تھا۔ براہ راست بھیک نہیں مانگتا تھا۔ انسانی فطرت کی برائیوں پر گفتگو شروع کرتا تھا۔ اور تب تک گفتگو جاری رہتی تھی جب تک اس کو ایک سکہ نا مل جاتا۔ جس طرح مصنف نے

اس کہانی کو لکھا ہے اسی طرح مترجم نے بھی اس کو ترجمہ کر کے اس کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔اس کہانی سے سبق آموز باتیں ملتی ہیں۔جو کہ گنپت لوگوں کو نصیحت کرتا تھا اور وہ جو بھی نصیحت کرتا تھا وہ سب کچھ حقیقت میں ہوتا تھا۔مصنف تو اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہے کہ کہانی دلچسپ ہو لیکن مترجم اس کو ترجمہ کر کے زیادہ دلچسپ بنا دیتا ہے۔کچھ لوگوں کی انگریزی اچھی نہیں ہوتی لیکن انہیں مطالعہ کرنے کا شوق بہت زیادہ ہوتا ہے۔تو وہ انگریزی کہانیوں کے تراجم پڑھ کر اصل کہانی والا لطف حاصل کرتے ہیں۔جو کہ ایک اچھا اور کامیاب مترجم اچھا ترجمہ کر کے دے سکتا ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کو ترجمہ نگاری کے فن پر کامل قدرت کے سلیقے سے بخوبی واقف ہیں۔وہ کہانی کو سیاق و سباق کے ساتھ ساتھ جذبہ و اثر سے مملو زبان و اسلوب عطا کر کے ان کو اردو زبان میں منتقل کرتے ہیں۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے تراجم کو پڑھ کر کبھی بھی ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کہانی ترجمہ شدہ ہے بلکہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی خود کی لکھی گئی کہانی ہے وہ اس قدر لگن اور محنت سے کام کرتے ہیں۔

"مرگ شجر" میں سڑک نکالنے کے لئے پہاڑوں کو چھانٹنا اور درختوں کی بے دریغ کٹائی سے لاحق ہونے والے خطرات اور ماحول پر اس کے مضر اثرات کو کہانی کے مرکزی خیال کے بطور پیش کیا گیا ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے ترجمے میں جو منظر کشی کی ہے وہ ان کی ہنر مندی اور زبان و بیان پر دسترس کی واضح دلیل ہے۔

> "میرے گھر کے قریب چھوٹی سی جگہ میں ہی شاہ بلوط کے بیس (۲۰) درخت گرا دیئے گئے اور یہ سڑک دیکھتے ہی دیکھتے جہاز کے کھیت تک پہنچ گئی جو یہاں سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ٹھیک ہے میں اب یہیں رہ کر اس تباہ کن پہاڑی کا نظارہ کروں گا۔راکیش پیپل کو تتلیوں والا درخت کہتا تھا۔کیونکہ اس درخت کے جب پنکھ والے بیج اڑتے تو وہ ہوا میں ادھر ادھر اڑتے ہوئے تتلیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔اب نا کوئی پیپل باقی رہ گیا۔نہ چمکدار سرخ پتے۔آسمان کی جانب اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور نہ کوئی پرندہ۔"(۵)

منظر کشی کے ساتھ ساتھ درختوں کے کٹان سے ماحول و مناظر پر جو مضر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔اس سب کی طرف قاری کو بڑی پختگی کے ساتھ دعوت فکر دینے میں بھی کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔اسلوب بیان اتنا جاندار ہے کہ ہر لفظ سے ادبی چاشنی اور مٹھاس کے پیمانے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔یوں سماج و ماحول کی عکاسی اس منظم اور مربوط طریقے سے کی گئی ہے۔کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں

کے اور پرندوں کے مصائب و مشکلات جو درختوں کی کٹوتی کی بنا پر رونما ہوئے ہیں۔ قاری کے ذہن و دل پر اپنی چھاپ مرتسم کرتے ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی تحریروں میں ادب کی روح اور اردو زبان کا احترام برقرار رکھا ہے۔ان کی تحریروں میں اردو زبان کے قدیم اور خالص الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔اور جدید زبان کی باریکیوں کو بھی بخوبی جانتے ہیں۔ان کی نثر میں اردو ادب کی اصل روح اور زبان کی قدیم روایت کی جھلک لگتی ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اردو زبان کی گہرائیوں کو سمجھا اور اس میں ادبی خوبصورتی کو اجاگر کیا۔ان کے اسلوب میں ایک تسلسل سے جو قاری کو قدم بہ قدم اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کے مضامین میں خیالات کے درمیان کوئی خلا نا ہو،اور ان کا ہر جملہ پچھلے جملے کو تقویت پہنچائے۔

"اچھوت" ایک مختصر کہانی ہے۔جس میں غریبوں کے تئیں امیروں کے نازیبا سلوک کو بیان کر کے سماجی حالت اور عوامی اذہان کی ترجمانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔مترجم نے اپنے علم، مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر کہانی کو اثر انگیز بنا کر پیش کیا ہے۔کہانی کے مطالعے کے دوران موصوف کی زبان دانی اور مہارت کا احساس ہوتا ہے۔

یوں آسان اور عام و فہم زبان میں ترجمہ پیش کر کے سماجی زندگی کی تلخ حقیقت کو قارئین کے ذہن و دل پر نقش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔موصوف نے کہانی کو نیا جامہ پہنا کر یہ واضح کیا ہے کہ رنگ و نسل ذات پات اور مقام و منصب سے انسان دوستی، محبت و بھائی چارہ بالاتر ہے۔کہانی کا راوی ایک بڑے آدمی کا بیٹا ہے جو اپنے گھر کی صفائی کرنے والے لڑکے کو صرف اس وجہ سے پسند نہیں کرتا ہے کیونکہ وہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔اس صفائی کرنے والے کو دوسرے لڑکے بھی نہیں پسند کرتے ہیں۔اور ان کے ماں باپ بھی انہیں اس سے دور رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔اس کہانی کے ذریعے اس بات کی صراحت کی گئی ہے۔خدمت گزار طبقے کی حثیت ان کے آقاؤں کے نزدیک محض خادموں کی ہوتی ہے،انسانوں کی نہیں۔اس کے علاوہ اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بڑے لوگوں کے تعلقات اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کیسے ہوتے ہیں۔ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ بڑے لوگوں کے بچے نوکروں کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکتے۔

کہانی "خواہش" میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان آزادی سے اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔جس کے لئے مشکلات کا سامنا کرنا ناگریز اور صبر و تحمل سے کام لینا از حد ضروری ہے۔حد درجہ، احتیاط برتنے

سے آزادی تو برقرار رہ سکتی ہے۔ لیکن ہر خواہش کی تکمیل ناممکن ہے۔ کیونکہ ایک خواہش کے بعد دوسری خواہش جنم لیتی ہے۔ اور یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہتا ہے۔ چوں کہ انسان لالچی ہوتا ہے، اور وہ زیادہ سے زیادہ پانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اور آخر کار اپنی لالچ کا شکار ہو کر سب کچھ کھو دیتا ہے۔ اس کہانی کو ایک بوڑھے فقیر اور ایک لڑکے کی گفتگو کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

> ''ہاں یہ سب کچھ بڑی آسانی سے کھو بھی سکتا ہے اور کوئی تم سے چھین بھی سکتا ہے، یا تم لالچی اور لاپرواہ ہو جاؤ گے اور پھر اچانک تمہارا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا۔ تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو کیونکہ میرا ابھی ایک خواب تھا جو پورا نہ ہو سکا۔ کہا تمہارا سب کچھ ختم ہو گیا۔''(۶)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے نفس مضمون کی ادائیگی میں مناسب اسلوب سے کہانی کو مؤثر بنا کر انسانی جذبات اور خواہشات کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ کہانی مختصر سہی، مگر اپنے معنی خیز اور نصیحت آمیز موضوع کے تحت ایک دلچسپ کہانی ہے۔ جس میں کرداروں کی نفسیات کا مطالعہ اس باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے کہ ان کے ظاہر و باطن سے قاری باخبر ہو کر اس دور کی سماجی حالت سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی تحریروں میں ادب کی روح اور اردو زبان کا احترام برقرار رکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں اردو زبان کے قدیم اور خالص الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ اور جدید زبان کی باریکیوں کو بھی بخوبی جانتے ہیں۔ ان کی نثر میں اردو ادب کی اصل روح اور زبان کی قدیم روایت کی جھلک ملتی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اردو زبان کی گہرائیوں کو سمجھا اور اس میں ادبی خوبصورتی کو اجاگر کیا۔ ان کے اسلوب میں ایک تسلسل سے جو قاری کو قدم بہ قدم اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کے مضامین میں خیالات کے درمیان کوئی خلا نہ ہو اور ان کا ہر جملہ پچھلے جملے کو تقویت پہنچائے۔

اسی طرح کہانی جنون ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پیدا شدہ صورتحال پر منحصر ایک کہانی ہے۔ جس میں دہلی، شاہ جہان پور، میرٹھ، بجھ پور اور دوسرے کئی شہروں میں انگریزوں اور دوسرے کئی مسلمانوں کے درمیان معرکہ آرائی سے رونما ہونے والی لوٹ کھسوٹ، دہشت اور قتل و غارت گری کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ کہانی ایک اینگلو انڈین گھرانے کے گرد گھوم کر پورے ہندوستان کی سیر کراتی ہے۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی جان

بچانے کی خاطر جن اذیتوں اور مصائب و مشکلات کے شکار ہوتے ہیں۔ ان سے اس وقت کے انسان کی وحشت اور زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہانی کے آغاز سے ہی یہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں:

> ''شدت کی گرمی پڑ رہی تھی جب ۱۰ مئی کو میرٹھ میں بغاوت ہو گئی۔ سپاہیوں نے اپنے ہی انگریز افسروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ شہر میں بھی لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ جیل کے دروازے توڑ دیئے گئے اور ہتھیار بند قیدی شہر اور چھاؤنی میں بسے ہوئے انگریزوں پر بل پڑے۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دی گئی اور لوگوں کو قتل کر دیا۔''(۷)

واقعات و حادثات اور کرداروں کی بہتات کے باعث کہانی کا پلاٹ پیچیدہ اور غیر منظم ہے۔ تاہم کہانی کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے پلاٹ میں ربط و تسلسل برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بادشاہ، نوابوں اور سپاہیوں کی حالت ان کی ذہنیت اور جذباتی وفور کے ساتھ ساتھ عوام کی سوچ و فکر، سماجی و معاشی حالت اور مذہبی و ثقافتی اقدار کی ترجمانی جس خوش اسلوبی اور باریک بینی سے اردو کے لباس میں منتقل کی گئی ہے۔ وہ ترجمہ نگاری کی فنکاری کا مین ثبوت ہے۔ بغاوت سے رونما ہونے والی صورتحال کا نقشہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ہنروری اور چابکدستی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے۔ کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں اور جذبات و احساسات کی گہرائیوں سے کہانی کو مؤثر بنا کر اس کی سماجی اور سیاسی خلفشار انتشار کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ جس میں ہر سو خونی مناظر برپا کئے ہیں۔

جرسی لباڈور، مریم، پلو، لال رام جی لال، جاوید خان، خان بیگم، میجر گھنشام، سنگھ، بوڑھی چاچی، منگل خان، سرفراز، حشمت، کامران، بدرن، عبدالرؤف، وغیرہ جیسے متعدد کرداروں کے ذریعے مختلف طبقوں کی نہ صرف بغاوت اور آزادی سے وابستہ جذبات و احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ منظر کشی کی ایسی مثالیں کہ قاری خود کو محو نظارہ پاتا ہے۔

> ''آفتاب صاف و شفاف چمکدار آسمان میں اگ آیا تھا اور خوش قسمت تھے وہ لوگ جو پو پھٹے ہی اٹھ گئے تھے۔ اور دریا کی طرف سے آرہی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سات بجے گرجا بھر کا گھنٹا بج اٹھا۔ لوگ چھاؤنی میں بنے اس چھوٹے سے مضبوط گرجا کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ لباڈور اس کی بیٹی کی طرح اتوار کی پوشاک پوشاک میں پیدل چل رہے ہیں۔ کچھ بگھیوں پر سوار تھے یا پالکیوں میں سوار تھے۔ جنہیں پسینے سے تر کہار کندھوں پر اٹھائے ہوئے دوڑ رہے تھے۔''(۸)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے اسلوب میں ایک ایسی دلکشی ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے اور ان کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ انہوں نے اردو ادب کی جمالیات کو بھرپور انداز میں سمویا ہے۔ان کی تحریروں میں تخلیقی حسن اور ادبی چاشنی کا ایسا امتزاج ملتا ہے۔کہ ایک عام قاری بھی ان کے مضامین میں دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ان کی زبان میں جو ادبی لطافت اور سادگی ہے وہ اردو زبان کی حقیقی جمالیاتی قدر کو سامنے لاتی ہے۔ان کے ترجمے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی خشک مضمون کو بھی جمالیاتی خوبیوں سے مزین کرتے ہیں۔جس سے منفرد خوبصورتی کا پہلو شامل ہو جاتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے ترجمے کی ایک بڑی خصوصیت ان کی روانی، سادگی اور شفافیت ہے۔انہوں نے انتہائی پیچیدہ موضوعات کو بھی ایسی سادہ زبان میں بیان کیا ہے۔کہ قاری کو نہ صرف سمجھنے میں آسانی ہوئی ہے بلکہ موضوع کے ساتھ گہرائی سے تعلق بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ان کا اسلوب اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب میں پیچیدگی یا مبالغہ آرائی کے بغیر بھی ایک مضبوط اور مؤثر بات کہی جا سکتی ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے تراجم نے قارئین کے لئے بہت آسانی کر دی ہے۔ان کے لئے پڑھنے اور سمجھنے میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ضیاء الرحمٰن صدیقی، پروفیسر، جنم دن (ترجمہ): پبلی کیشنز ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۱۹ء، ص۹

۲۔ ایضاً، ص۳۲

۳۔ ایضاً، ص۳۶

۴۔ ایضاً، ص۵۷

۵۔ سہ ماہی ورثہ، نیویارک، جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر، اپریل تا جون ۲۰۲۴ء، ص۳۷

۶۔ ایضاً، ص۳۷

۷۔ ایضاً، ص۴۷

۸۔ ایضاً، ص۴۷